اسفلُ سافلین

ثناء احسان یوسفزئی

ناول

ثناء احسان یوسفزئی

Writer's email address: sanaehsanusafxai@gmail.com

میں آئزک ہوں۔

ارے ارے آپ میرا نام اور میری کتھا کا عنوان پڑھ کر یقیناً یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کوئی بہت ہی برا اور گنہگار یہودی ہوں۔ قصور آپ کا بھی نہیں ہے۔ آپ جس معاشرے میں پلے بڑھے ہیں وہاں کے انسانوں کا یہی پیمانہ ہے۔ کسی کا نام اور کسی کا ظاہر دیکھ کر جنت اور جہنم میں بھیج دینے والا۔

آپ کو میری باتیں کڑوی لگیں گی کیونکہ میں سچ زیادہ بولتا ہوں، لیکن مجھے کوئی متقی سمجھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

آپ کو ایک بات سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی؟ میں کیا کوئی نارمل انسان نہیں ہو سکتا؟ میرا نام دیکھا اور مجھے یہودیوں کا ایجنٹ بنا دیا، ذرا سیدھی بات کی میں نے اور آپ مجھے کوئی بہت پارسا سمجھنے لگ گئے ہیں، اب خدارا مجھے تو سن لیں۔

کیا میں ایک عام انسان، غلطیاں کرنے والا، غلطیوں پر پشیمان ہونے والا، گناہ کرنے والا سیدھا سادہ سا انسان نہیں ہو سکتا؟ آپ کے میرے بارے جو تاثرات ہیں، اپنے بارے میں کیوں نہیں ہیں؟ کیا صرف مجھے ہی پرفیکٹ ہونا چاہیے۔ آپ کو نہیں؟

شکر ہے آسمانی کرسی والا خدا آپ جیسا نہیں ہے۔ شکر ہے۔

خیر میں محمد آزک ہوں۔

ہاں ہاں مجھے پتہ چل گیا۔ آپ میرے بارے میں ابتدائی گمان رکھ کر بہت پشیمان ہیں۔ اب خاموشی سے مجھے سننا ہے آپ نے ٹھیک ہے؟ میرے بارے میں کوئی رائے رکھے بغیر۔

لغیر میرا خدا ہے۔ میرے اعمال پر کوئی تبصرہ کرنے کا اختیار آپ کو نہیں ہے۔ سمجھے آپ؟

مجھے معلوم ہے کہ آپ اب یہ سوچ رہے ہیں کہ جب میں اپنے بارے میں آپ کے تاثرات جاننا ہی نہیں چاہتا تو میں آخر یہاں کچھ لکھ ہی کیوں رہا ہوں؟ کیونکہ اگر میں نے ابھی کسی کو اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات نہیں بتائے تو میرا سانس گھٹ جائے گا۔ ہوا ہے آپ کے ساتھ کبھی ایسا؟

کبھی کبھی میرے سینے پر جیسے منوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ اکثر رات کے تین بجے میں شدید گھبراہٹ سے جاگ جاتا ہوں۔ پھر میرا دل اونچی دھڑکن سے مجھے آواز دیتا ہے۔ میں لائٹ بند کر کے نہیں سو سکتا، پھر میں بستر سے اٹھ کر قریبی پارک میں نکل جاتا ہوں۔ واک کرنے کی نیت سے میں بے ڈھنگے انداز میں ٹریک پر چلتا ہوں۔ اب تو مجھے پارک کا سکیورٹی گارڈ بھی جان گیا ہے اور وہ مجھ سے زیادہ استفسار بھی نہیں کرتا۔

نہیں نا، آپ چپ نہیں کر سکتے کچھ دیر کے لیے؟

مجھے کوئی فوبیا، کوئی خوف نہیں ہے، نہ ہی میں نے اپنی گزری ہوئی زندگی میں کوئی ایسا گناہ

کیا ہے کہ پچھتاوے سے مجھے کوئی چبھن ہو۔

میں ایک بے حد خوش باش، ہینڈسم، پرکشش جوان ہوں۔ یہ میں اپنی تعریف نہیں کر رہا، کم از کم میرے انسٹیٹیوٹ کی تمام لڑکیاں اور کلاس فیلوز میرے بارے میں یہی کہتے ہیں۔ آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کیونکہ آپ مجھے ایسا نہیں سمجھتے۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ آپ میرے لئے اجنبی ہیں، اور میں آپ کے لیے۔ اجنبیوں کو بہت کچھ بتانا آسان ہوتا ہے، وہ آپ کو جج نہیں کرتے ہیں۔ وہ آپ کے بارے میں نیوٹرل ہوتے ہیں، ہے نا؟

تو آپ بھی مجھے چپ چاپ سنیں گے، جیسے آپ کوئی کہانی پڑھ رہے ہوں۔ اور ہاں، آپ کسی کو بتائیں گے بھی نہیں۔ پرامس؟

میری عمر تیس سال ہے۔ میرا قد چھ فٹ کے قریب ہے، میں پیدائشی مسلمان نہیں تھا۔ مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ میں مسلمان ہونے سے پہلے کیا تھا، یا پھر میں کس مذہب پر پیدا ہوا تھا۔

ہاں آپ ٹھیک سمجھے، مجھے یاد ہے لیکن میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا۔ اس لیے نہیں کہ آپ کو میرا خدا بننے کا شوق ہے یا پھر مجھے آپ کے تاثرات اور میرے پچھلے مذہب کے عقائد پر اختلافِ رائے سے خوف ہے۔ نہیں۔ مجھے کم از کم ابھی انسانوں سے ڈر نہیں لگتا۔ مجھے فرق نہیں پڑتا کہ اب میرے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں، مجھے پسند کرتے بھی ہیں یا نہیں۔ وہ چودہ سال پہلے والا آزر ک تھا جو گلی میں گزرنے والی بھی (ملنگ) عورت تک کے تبصرے سے ڈرتا تھا۔ اب میں بہت سنگ دل، بے نیاز اور بے رخ ہو چکا ہوں۔ وہ الگ بات اب اس کا فائدہ بھی نہیں ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ میں پیدائشی مسلمان نہیں تھا، میری ماں کا بھی پتہ نہیں کون سا مذہب

تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ ہمارے درمیان کبھی اس پر تفصیلی بات بھی ہوئی ہو۔

اپنی ماں کے بارے میں ایک بات بہت اچھے سے جانتا ہوں۔ وہ بہت، بہت، بہت خوبصورت عورت تھی۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ وہ میری ماں تھی بلکہ وہ واقعی حقیقت میں بہت خوبصورت تھی۔ وہ سویڈش تھی، برف والوں میں سے تھی۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو، برف والے بہت خوبصورت ہوتے ہیں، پوری دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت عورتیں سویڈن کی عورتیں ہیں۔ شفاف رنگت والیں، لمبی خوبصورت جھیل سی آنکھیں، برف کی مورتوں جیسے بہت خوبصورت چہرے، آپ کو برف کے علاوہ شاید ہی کہیں ملیں۔

ہماری کمیونٹی والے کہتے تھے میں شکل میں اپنی ماں پر گیا ہوں۔ میرا باپ کینیڈین تھا، لیکن وہ اتنا خوبصورت نہیں تھا یا شاید مرد کتنا بھی خوبصورت کیوں نہ ہو جائے، وہ عورت کے مقابلے میں ہمیشہ دوم نمبر پر آتا ہے۔ میرا باپ میری پیدائش سے چند مہینے پہلے قتل ہو گیا تھا، اور میری ماں اپنی تمام تر خوبصورتی سمیت کریما کا آ گئی۔

ہی آپ کچھ سمجھے، میں نے اپنی کہانی کے درمیان کے ایک حصے کو گول کر دیا ہے۔ خیر آپ سے کیا پردہ ہے۔ آپ نے کون سا کسی کو بتانا ہے۔

دراصل میرا باپ ایک کینیڈین تھا۔ میری ماں کو سویڈن کے جوانوں سے وہ زیادہ خوبصورت لگا تھا کیونکہ میری ماں ایسٹرڈ اپنے نام کی طرح خوبصورت تھی، اور وہ حسن کے معاملے میں انتہا پسند تھی۔

وہ کسی شیطان سے بھی محبت کر سکتی تھی بشرطیکہ وہ خوبصورت ہوتا۔ میرا باپ بھی شاید ویسا ہی شیطان تھا۔ آپ کو سچ بتاؤں تو سارے شیطان اپنے ظاہر میں بڑے خوبصورت ہوتے ہیں، صرف تب تک جب تک ان کے ساتھ واسطہ نہیں پڑتا۔

ہاں تو میری ماں کا نام اسٹریڈ تھا۔ وہ میرے باپ گراہم کو حسن کا دیوتا سمجھنے لگی تھی۔ وہ شاید غلط بھی نہیں تھی، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ میرا باپ میری ماں سے زیادہ خوبصورت نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ مرد تھا، یا شاید اس لیے کہ وہ اپنے اعمال کے ظاہر ہونے کے بعد سب کو بدصورت لگنے لگا تھا۔ یا پھر شاید اس کی ایک وجہ محبت بھی تھی، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ محبت میں انسان محبوب کو دیوتا سمجھنے لگتا ہے؟

خیر میں آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کیونکہ میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔ اس سے فرق بھی نہیں پڑتا، کیونکہ برائی کو دیکھنا بھی کون چاہتا ہے۔

شادی کے بعد میری ماں کو معلوم ہوا کہ وہ جس کمپنی میں ملازمت کی بات کرتا تھا وہ ایک کال گرلز کی فرم تھی۔ وہ حسن کا مداح تھا صرف اس لیے کہ وہ حسن کی قیمت لگانا جانتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے مجھ سے شادی صرف اس لیے کی تھی کہ وہ حسن کو ہمیشہ اپنی دسترس میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہر اس شے کو اپنے قبضے میں چاہتا ہے، جو دیکھنے والی آنکھ کو مبہوت کر دے۔ اس نے مجھے انسان نہیں ایک نمائشی شے ہی سمجھا۔ وہ میری بھی نمائش کرنا چاہتا تھا۔ میری ماں اکثر روتے ہوئے صرف یہی بات کرتی تھی۔ مجھے پہلے سمجھ نہیں آتی تھی لیکن بعد میں مجھے اس کہانی کی تفصیل میری ماں کی ایک دوست نے سنائی تھی، تب مجھے معلوم ہوا میری ماں رات کے اندھیرے میں کیوں روتی ہے؟

تو ہاں میں کیا بتا رہا تھا؟ میں اکثر بات کرتا کرتا بھول جاتا ہوں۔ مجھے کوئی یاد آ جاتا ہے۔ کیا کبھی بات کرتے کرتے آپ کو کسی کی خوبصورت اداس لیکن بے حد سفید آنکھیں نظر آئی ہیں!؟ اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کے سفید دانتوں کی چمک نظر آئی ہے؟ جو آپ کو سب کچھ بھلا دے، یوں کہ لمحہ بھر کے لیے آپ کا سانس رک جائے۔ جیسے آپ کے سینے میں سوئی

گاڑ دی گئی ہو۔ پھر اگلے لمحے آپ سر جھٹک کر "ان آنکھوں" کو بھلانے کی کوشش کریں، اور اس بات کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو اس کیفیت سے پہلے آپ کر رہے تھے۔ بس میرے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کب سے ہو رہا ہے؟ پتہ نہیں۔ شاید پچھلے چھ سالوں سے۔ ہاں۔ تب سے ہی۔ اچھا چھوڑیں میری بات کو۔ تو میں آپ کو اپنی ماں کی باتیں بتا رہا تھا۔

میرا باپ خوبصورت چہروں کی خرید و فروخت کا بہت بڑا سرغنہ تھا۔ میری ماں سے شادی کے بعد اس نے شاید میری ماں کو بھی ایسا ہی خوبصورت چہرہ سمجھنا چاہا تھا، لیکن میری ماں لاکھ حسن پرست سہی، آخر تھی تو وہ برف والوں میں سے ہی۔

برف والے بہت خوبصورت ہوتے ہیں، یونانی دیوتاؤں کے مجسموں جیسے، لیکن یہ برف جیسے سرد بھی ہوتے ہیں۔ جہاں محبت سے، اپنی خواہشات سے کنارہ کشی کرنا چاہیں، دل پر برف کی چٹان رکھ کر بہت آسانی سے سرد مہری اپنا لیتے ہیں۔ اپنے جذبات کو برف کا ٹکڑا بنا لیتے ہیں۔

میری ماں بھی برف کی ایک خوبصورت چٹان بن گئی تھی۔ میری پیدائش سے پہلے اس برف کی مجسمے نے ایک انسان کو مار ڈالا تھا۔

میں چونکہ آپ کو اپنی کہانی سنانا چاہتا ہوں، اس لیے تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میری ماں کی کہانی آپ میری ماں کے جاننے والوں میں سے کسی سے بھی پوچھ لیں آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ میری کہانی آپ کو میرے علاوہ کسی سے بھی سننے کو نہیں ملے گی۔

آپ حیران ہوئے کہ میری ماں کی کہانی کو میں اتنا آسانی سے بغیر دکھی ہوئے سنا رہا ہوں؟ تو وہ اس لیے کہ یہ میری کہانی نہیں ہے۔ مجھ پر نہیں گزرا، اور اس کو میں نے سنڈے میگزین میں چھپنے والی کہانیوں کی طرح اتنی دفعہ سنا ہے، اتنی دفعہ سنا ہے کہ اب میں بے تاثر

ہو چکا ہوں۔

جی آپ کو سچ لگ رہا ہے، پتھر دل بھی۔ وجہ آپ کو آخر میں خود سمجھ آ جائے گی۔ تو پھر میری ماں نے میرے باپ کو ایک رات قتل کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ میرا باپ چاہتا تھا، مجھے پیدا کرنے کے بجائے میری ماں اباشن کرا لے۔ مجھے اپنی ماں سے ایک گلہ یہ بھی ہے، کاش وہ مجھے پیدا نہ کرتی، وہ مجھے اباشن کر لیتی۔ میں اپنی ساری زندگی کی تکالیف سے میں بچ جاتا۔ آپ ناشکرا سمجھیں گے لیکن آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں، آپ خود پیدا ہونا چاہتے تھے؟ اپنی مرضی سے تو اس دنیا میں آدم بھی نہیں اترے تھے۔

میری ماں نے پہلے سے انتظامات کر رکھے تھے۔ آپ کو بتایا نا کہ برف والوں کو صرف اپنے جذبات پر فیصلے کرنے کی دیر ہوتی ہے۔ پھر وہ انسان نہیں رہتے۔ میری ماں نے اپنی حسن پرستی میں انتہا پسندی کو بھی پر فیلا کر لیا تھا۔ میرے باپ کو اسی کے ایک اڈے پر قتل کرنے کے بعد، وہ پہلی فلائٹ سے جمانکا آ گئی۔

ارے آپ جمانکا نہیں جانتے؟ یہ افریقہ اور یورپ کے مابین ایک ریاست ہے۔ سیاہ فاموں کی ریاست!

”میں نہیں چاہتی تھی میں اپنی زندگی میں کبھی بھی کوئی خوبصورت چہرہ دیکھوں۔ اس سے مجھے کراہم یاد آئے گا۔ میں نے تمہاری پیدائش سے پہلے بہت دعا کی تھی کہ تم اپنی شکل میں باپ پر نہ جاؤ، اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہارے نقوش بگاڑ کر ان سیاہ فاموں جیسا کر دیتی۔“ میری اٹھارویں سالگرہ کے بعد جب ایک دفعہ میں نے بہت مان سے ماں سے پوچھا کہ میں کس پر گیا ہوں تو وہ یہ بولی تھی۔

وہ جمانکا کیوں آئی؟ شاید اس لیے کہ وہ خود کو تکلیف دینا چاہتی تھی، یا میرے باپ کا

بدلہ مجھ سے لینا چاہتی تھی۔ پھر میری پیدائش جمائکا میں ہی ہوئی۔ میں اگر ابھی ہجرت کرنے کی نیت سے نیویارک نہ آیا ہوتا، تو ابھی جمائکا میں ہی ہوتا۔

ہجرت اس لیے کہ......

رکیں۔ مجھے ایک بار پھر دو چمکتی سفید آنکھیں اور دودھیا دانتوں کی مسکراہٹ یاد آ گئی ہے۔ کیا مجھے دہرانے کی ضرورت ہے کہ میرا سانس پھر اٹکا۔

ہاں، میں کیا کہہ رہا تھا؟

میں اپنی ساری زندگی جمائکا میں ہی رہا۔ اب یہاں سے میری کہانی شروع ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

میں سیکنڈ گریڈ میں تھا جب سیاہ فام میڈم ایگنیس نے ایک دن فارم پر کرتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا۔

"آرزک! آپ کا مذہب کون سا ہے؟"

میں ایک دس سالہ بچہ تھا، میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"لیکن وہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

میڈم ایگنیس نے بہت تاسف سے سر جھکا اور فارم پر مذہب کے خانے میں کچھ لکھا۔

دو دنوں کے بعد جب وہ فارم میرے گھر میں سرپرست کے دستخط کے لیے میری ماں کے پاس پہنچا تو انہوں نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ تمہارا مذہب عیسائیت ہے؟"

میں نے ناسمجھی سے اپنی ماں کو دیکھا۔

"یہ مذہب آخر ہوتا کیا ہے؟" میں دن بھر ویڈیو گیمز کھیلتا تھا، میں نے کبھی مذہب کے نام

پراپنی ماں سے کچھ نہیں سیکھا تھا۔

میری ماں نے خاموشی سے مجھے دیکھا اور پھر مجھے اگلے دن سکول لے جا کر میرے سامنے ہیڈ مسٹریس سے میری کلاس ٹیچر کی شکایت کی۔

''میرے بیٹے کا مذہب اپنی مرضی سے لکھا، یہ انتہائی ذاتی اور غیر اخلاقی عمل ہے۔'' میں نے پہلی دفعہ اپنی ماں کو غصے میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے برف کی طرح لگی تھی۔ بے حد ٹھنڈی برف، جیسے موت ہوتی ہے۔ برف والے غصے میں آگ نہیں برف بنتے ہیں۔ برف آگ سے زیادہ طاقتور ہے۔

میڈم ایگنیس نے بہت معذرت کی لیکن میری ماں پھر بھی بہت غصے میں تھی۔ ہیڈ مسٹریس نے نیا فارم نکال کر بھرتے ہوئے میری ماں کی طرف قلم بڑھایا کہ وہ مذہب کا خانہ خود پر کرے۔ میری ماں فارم فل نہیں کر سکی تھی۔ بہت خاموشی سے میری ماں میرا ہاتھ پکڑ کر واپس پلٹ آئی۔ اس کے بعد میں نے کبھی اس اسکول میں قدم نہیں رکھا۔ میری ماں نے چند ہفتوں تک میرا دوسرے اسکول میں داخلہ نہیں کروایا تھا۔ ایک دن میں نے بہت سنجیدگی سے اپنی ماں سے پوچھا۔

''آپ نے اس دن میرے مذہب کے بارے میں اتنا غصہ کیوں کیا تھا؟ آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں کہ میرا مذہب کون سا ہے؟''

میری ماں نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایسا وہ تب دیکھتی تھیں جب میں کوئی ضد کرتا۔ لیکن اس دفعہ میرا سوال میرا تجسس تھا۔ مجھے یاد ہے میری ماں نے مجھے اپنی گود میں بٹھایا اور میرے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مذہب انسانیت ہے۔ ہم سب کا مذہب انسانیت ہے۔ **Humanity**''

"انسانیت؟" میں نے بہت حیرت سے پوچھا۔ "انسانیت کیا ہوتی ہے۔"

میری ماں باتیں بہت مشکل کرتی تھی۔

"ہاں، تم نے صرف ایک اچھا انسان بننا ہے، کسی مذہب پر یقین نہیں رکھنا۔ جو مذہب کا نام لیتے ہیں وہ مذہب کے پردے میں شر پھیلاتے ہیں۔ ہم صرف انسان ہیں اور ہمیں ہمیشہ اچھا انسان ہی بننا ہے۔" وہ مجھے انسانیت کا درس دے رہی تھیں۔

اس کے بعد میں نے ہمیشہ اچھا انسان بننے کی کوشش کی۔ میرے اچھے انسان کی کوشش اگلے آٹھ سال تک جاری رہی۔ میرے نزدیک انسانیت، راستے میں کسی فقیر کو اپنے لنچ میں سے کچھ کھلا دینا ہوتا تھا، اسی طرح اسکول وین میں اسکول کی پرانی اسٹاف ممبر میڈم گریس کے لیے جگہ بناتے ہوئے مجھے لگتا تھا کہ میں بہت اچھا انسان ہوں۔

یہ وہ اچھا انسان تھا جو سالوں میرے اندر راسخ ہو رہا تھا، لیکن پھر ایسا کچھ ہوا کہ میرے اندر کا اچھا انسان ہمیشہ کے لیے کانپ کر رہ گیا۔

☆......☆......☆
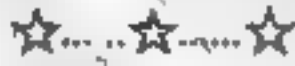
میرے ہائی اسکول کا آخری سال تھا، یہ سال مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس سال میری ماں کو انجائنا کا پہلا، دوسرا اور آخری اٹیک ہوا تھا۔

مجھے اس سال اچھے گریڈز لے کر اچھی جگہ ایڈمیشن لینا تھا۔ میری ماں چاہتی تھی میں ایک جرنلسٹ بنوں۔ انہوں نے مجھے کبھی خود کہا نہیں تھا لیکن وہ کہتی تھیں، جرنلسٹ اچھے ہوتے ہیں، ایک سچا جرنلسٹ ہمیشہ اچھا انسان ہوتا ہے۔ مجھے ان کی بات کبھی سمجھ نہیں آئی۔ خیر، مجھے ان کی کوئی بھی بات کبھی بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

میں ایک جرنلسٹ بننا چاہتا تھا۔ ایک اچھا انسان۔ ہاں تو میں ہائی اسکول میں تھا، ہمارا

ایک گروپ پروجیکٹ تھا جس میں میرے ساتھ ایک نیو اسٹوڈنٹ بھی تھی۔
صوفیہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں جتنا خاموش اور ریزروڈ تھا، صوفیہ اتنی ہی باتونی تھی۔ سب سے مزے کی بات یہ تھی، وہ مجھے باتیں کرتے ہوئے بہت اچھی لگتی تھی یا شاید وہ بولتی ہی بہت خوبصورت تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، عام باتیں۔ لیکن زندگی سے بھرپور باتیں، مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی ہوتی، شاید سب کو ہی ہوتی تھی۔
''تمہارا مذہب کیا ہے؟'' ایک دفعہ گروپ میٹنگ کے بعد کینٹین میں فرائیز اٹھاتے اس نے بہت آرام سے مجھ سے پوچھا۔ مجھے اس کا سوال لایعنی لگا۔ بالکل بے مقصد۔ مجھے الجھن بھی ہوئی تھی۔ چاہے وہ چھ سالہ چھوٹا آرزک تھا یا اٹھارہ سالہ بالغ آرزک، سب کو میرے مذہب میں بہت دلچسپی تھی۔ کاش میری ماں کو معلوم ہوتا اسکول تبدیل کر لینے سے بھی میں اس سوال سے چھٹکارا نہیں پا سکتا تھا۔
''میں صرف انسانیت پر یقین رکھتا ہوں۔'' میں نے قدرے خشک انداز میں کہا۔
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں مذہب کی بات کر رہی ہوں۔'' اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔
''انسانیت ہی میرا مذہب ہے۔''
مجھے کوفت ہوئی۔ کیا یہ ضروری تھا کہ شناخت کے لیے مذہب بھی لازمی ہو؟ یا انسانیت پر یقین رکھنے والوں کا بھلا کون سا مذہب ہوتا ہے۔
''لیکن مذہب تو انسانیت پر مقدم ہے، تمام مذاہب ہی انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ مجھے لگتا تھا تم کیتھولک ہو۔'' وہ واقعی کچھ زیادہ بولتی تھی۔
مجھے نہ جانے کیا ہوا، شاید یہ میری ماں کا ہنگامی ریفلیکس تھا جسے میں نے ان سے مستعار لیا تھا، میں ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔

"کون سا مذہب انسانیت کا درس دیتا ہے؟ مجھے کوئی ایک ایسا مذہب دکھا دو، جہاں انسانیت کے تقدس کا احترام کیا گیا ہے۔ چاہے وہ دنیا کی اکثریت میں ہو یا اقلیت میں۔ دوسرے انسانوں کو قتل کرنے، ان پر بم گرانے، ان کو گاجر مولیوں کی طرح کاٹنے کے بعد کون سا مذہب ہے جس نے انسانیت کا درس دیا۔ میرا نہیں خیال اوپر کوئی ایسا خدا بیٹھا ہے جو دوسروں کو قتل کرنے کے پیغام بھیجتا رہتا ہے۔ میرا مذہب اور اس سے وابستہ خیالات سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں ان پر یقین رکھتا ہوں نہ مجھے ان میں دلچسپی ہے۔"

میں اپنی تقریر کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نظر صوفیہ الیگزینڈر کو دیکھنے کے بعد میں وہاں سے چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں زخمی ہرنی کا سا تاثر تھا۔

اس کے بعد یا تو میں اسے نظر انداز کرتا تھا، یا وہ دانستہ طور پر مجھے اگنور کرتی تھی۔ میں اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

میں نے آپ کو اپنے بارے میں شاید ابھی تفصیل سے نہیں بتایا۔ دراصل میں رنگت میں سفید فام ہوں۔ سیاہ فاموں کے معاشرے میں اگر کلاس میں واحد سفید فام ہو تو اس کا مطلب تھا مجھے ضرورت سے کہیں زیادہ توجہ ملتی تھی۔ میں کم گو تھا تو شروع سے لوگ مجھے مغرور سمجھتے تھے اور چونکہ زیادہ تر گورے عیسائی ہوتے ہیں اس لیے میرے بارے میں بھی یہ خیال کیا جانے لگا کہ میں بھی ایک عیسائی گورا ہوں۔ میں زیادہ دوستی کرنے کے حق میں نہیں تھا نہ ہی کسی کو اپنے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ مجھے ان دنوں بس اچھا انسان بننے کی خواہش تھی اور اگر کوئی اچھی عادت مجھ میں تھی بھی تو صرف اس لیے کہ اچھے انسانوں کی عادتیں اچھی ہوتی ہیں۔

شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے، اگر نہیں سمجھے تو بھی خیر ہے، ہر بات سمجھنے کے لیے ہوتی بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد صوفیہ الیگزینڈر سے پھر میری ملاقات ہائی اسکول سے پاس آؤٹ ہونے کے چند سالوں بعد ہوئی۔ میں جرنلزم پڑھنا چاہتا تھا اور وہ جرنلسٹ بننا چاہتی تھی۔ دونوں میں فرق تھا۔ میں جانتا تھا، جس رفتار سے وہ گفتگو کرتی ہے، مخالف کو روشن آنکھوں سے دیکھ کر سوال داغتی ہے، اسے ایک جرنلسٹ ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بعد میں نے صوفیہ الیگزینڈر کو یوسی سی (یونیورسٹی آف کامن ویلتھ کیریبین) میں دیکھا تھا۔ وہ ایک بہت شارپ، بہت تیز اور ذہین اسٹوڈنٹ تھی۔

میں اسے پہچان گیا تھا، جان تو شاید وہ بھی مجھے گئی تھی لیکن اس نے صرف خاموش بولتی آنکھوں سے مجھ پر ایک نظر ڈالی تھی۔ مجھے لگا تھا وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہے۔ ہم دونوں کلاس میٹس تھے۔ میری کوشش ہوتی میں زیادہ تر اکیلے رہوں، مجھے بات چیت کر کے دوستی کرنے سے خوف آتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں لیکن میں دوستی کے معاملے میں بہت اچھا کبھی نہیں رہا تھا، نہ ہی مجھے کبھی بیسٹ فرینڈ پالنے کا شوق چڑھا تھا۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔

یونیورسٹی میں بھی میرا کم و بیش یہی طرز عمل رہا۔ فرق صرف اتنا تھا، اب میں کلاس میں واحد سفید فام نہیں تھا۔ چند ایشیائی اور مغربی طالبعلم بھی ہمارے ہم جماعت تھے جو بے حد سیاہ رنگ کے چہروں میں ممتاز نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے ہمیں ایک دفعہ ایک مکمل ٹاک کی اسائنمنٹ ملی تھی۔ تنقید برائے تنقید پر ایک جرنلسٹ (صحافی) کا ردعمل۔ کلاس میں تمام طلباء گروپ اور جوڑوں کی شکل میں کام کر رہے تھے۔ ایک واحد میں تھا، جس کا کوئی پارٹنر نہیں تھا۔ ان دنوں سفید فاموں نے امریکی ریاست ورجینیا میں سیاہ فاموں کا قتل عام کیا تھا۔ میرے بارے میں بہت کم معلومات رکھنے والے میرے ہی کلاس فیلو مجھے کسی انتہا پسند نظریے کی سوچ کا حامل سمجھتے تھے۔ مجھے پہلی دفعہ بہت

حیرت ہوئی تھی۔شاید ذہنی اذیت بھی۔کسی کا ظاہر کیا اس کے باطن کا پرتو ہو سکتا ہے؟ کیا رنگت، حسن اور انسانی خدوخال، انسانی بدصورتی پر پردہ ڈال سکتی ہے؟

میں اس اسائنمنٹ پر محنت کر رہا تھا اس لیے مجھے اکیلے ایک گروپ کا مقابلہ کرنے میں کوئی عار نہیں تھا۔کم از کم مجھے ایسا ہی لگتا تھا۔جب میرا رول کال ہوا تو پروفیسر ایڈم نے بہت حیرت سے عینکوں کے پیچھے سے مجھے دیکھ کر دوبارہ پوچھا۔"آپ اکیلے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔سر نے تاسف سے اپنا سر ہلایا،شاید وہ وجہ بھی جان گئے تھے۔

پہلا راؤنڈ خوش اسلوبی سے گزر گیا۔میں اساتذہ کی تنقید کا بہت مہارت سے جواب دے رہا تھا۔لیکن پھر آخری راؤنڈ نے مجھے اپنی زندگی کے ایسے موڑ پر لا کھڑا کر دیا جہاں میں سالوں اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔

وہ میرے کولیگ جرنلسٹس ہی تھے جن کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ حلق کیسے سوکھ جاتا ہے۔

"مسٹر آزک! آپ مذہب کو اپنی زندگی میں کس مقام پر رکھتے ہیں؟"

سات افراد کی ٹیم کی گروپ لیڈر نے ایک سو چالیس اسٹوڈنٹس کی کلاس کے سامنے مجھ سے پوچھا۔

"میں کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتا سوائے انسانیت کے، جو میرے نزدیک سب سے مقدم ہے۔"میں نے بہت عام سے انداز میں کہا۔

"لیکن مذہب تو مذہب ہوتا ہے، آپ اس سے انکاری نہیں ہو سکتے۔اگر آپ خدا سے انکاری بھی ہیں تب بھی آپ ایک اسکول آف تھاٹ سے تعلق ضرور رکھتے ہیں۔"

گھنگھریالے بالوں کی بہت ساری چھوٹی بڑی لٹیں اس کے چہرے کے گرد بکھری ہوئی

تھیں۔ سیاہ چہرہ مائیک پر بہت نرمی سے سوال پوچھ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا، اس نرم لہجے میں کتنے سخت الفاظ مخفی ہیں۔

"میں خدا پر یقین یا اس سے انکار اپنا ذاتی معاملہ سمجھتا ہوں، اس لیے اس طرح کسی بھی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں، میں انسانیت کا سبق پڑھتے بڑا ہوا ہوں، اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہر دور میں تمام مذاہب نے مذہب کے پردے میں ہمیشہ انسانیت کا گلا گھونٹا ہے۔ اس لئے میں صرف انسانیت کو اپنا خدا مانتا ہوں۔"

چند جوان جذباتی طلباء نے میرے لئے بہت اونچی تالیاں بجائیں۔ کوئلے کی سی بے حد سیاہ رنگت والا چہرہ اب بھی پرسکون تھا۔ بہت اطمینان سے اس نے کہا۔

"یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے مسٹر آرتک کہ آپ بلیک امریکنز (سیاہ فام امریکیوں) پر ظلم کے بالکل خلاف ہیں۔"

اس کا اشارہ اس تازہ سانحے کی طرف تھا جس پر پورے افریقہ میں یوم سیاہ منایا جا رہا تھا۔ میں ایک دم جز بز ہوا۔ میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ بے شک میں سمجھتا تھا کہ یہ غلط ہے لیکن میں نے نہ جانے کیوں جواب دینے میں لحہ بھر توقف کیا تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے یہ سارا معاملہ ہی انسانیت کا ہے۔ ظاہر ہے چاہے وہ سفید فام ہو یا سیاہ فام، میں اس دور میں انسانوں کا رنگ کی بنیاد پر تعصب کا شکار ہونا بے بنیاد سمجھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ میرے لہجے میں شاید چند دنوں پہلے کی اذیت بھی تھی کہ مجھے بھرے مجمع میں صرف سفید فام ہونے کی وجہ سے قابل نفرت سمجھا گیا۔ میں بھی تو اقلیت ہی تھا، مجھ سے بھی بائیکاٹ ہی کیا جا رہا تھا۔

سیاہ چہرے والی لڑکی نے اگلا سوال کیا کیا مجھے نہیں یاد، لیکن وہ باقی سوالات نارمل تھے۔ کم

از کم مجھے نارمل لگے تھے۔ میں شاکی اس لئے ہوا تھا کیونکہ وہ گفتگو مذہب سے شروع کی گئی تھی لیکن مثبت انداز میں اختتام پذیر ہوئی، بلکہ عنوان بدل لیا گیا تھا۔

محفل ناٹک کے اختتام پر جب میں ہال سے نکلا تو پیچھے سے کسی نے پکارا۔ وہی سیاہ چہرہ۔ وہ صوفیہ الیگزینڈر تھی۔ اس کا سیاہی سے چمکتا بے حد ملائم چہرہ، جو گھنگھریالے بالوں کی موٹی لٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

''آزبک! یقیناً تم حیران ہوئے ہو گے؟'' اس نے دوستانہ لہجے میں کہا تھا۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''کیا ہم کینٹے تک ساتھ چل سکتے ہیں؟'' بہت سادگی سے اس نے آفر کی۔ میں خاموشی سے ساتھ ہو لیا تھا۔

''یہاں سب تمہیں اپنے رنگ کی وجہ سے برا لگتے ہیں۔'' اس نے یقیناً ''دشمن'' کی جگہ ''برا'' کا استعمال کیا تھا۔

''کیا فرق پڑتا ہے؟'' میں نے کندھے اچکائے۔ میری زندگی میں جب جب مجھے فرق پڑا ہے میں نے بہت مہارت سے یہ فقرہ بولا ہے۔

''پھر بھی اقلیت رہنا میں سمجھ سکتی ہوں۔'' کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ میں خاموشی سے اس کو دیکھتا رہا۔

''میں نے سب کے سامنے مذہب کی بات اس لئے کی کہ میں تمہارا انسانیت والا خیال سب کے سامنے پیش کرنا چاہتی تھی، صرف یہ بتانے کے لیے کہ تم ہمارے دشمن نہیں ہو۔ اگر تمہیں برا لگا تو معذرت چاہتی ہوں۔'' وہ سچائی سے بولی تھی۔ مجھے پہلی دفعہ سچائی اتنی جامد شکل میں نظر آئی تھی۔

"لیکن ایسا کرنے کا کیا فائدہ؟" میں نے عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیا ہر کام میں فائدہ اور نقصان ڈھونڈنا چاہیے؟ میں نے بھی یہ انسانیت کے ناطے ہی کیا تھا۔" وہ جواباً مجھے لاجواب کر گئی تھی۔

"تمہیں یاد ہے سکول میں ایک دفعہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مذہب کو نہیں مانتے؟" اس نے ایسے پوچھا جیسے کوئی بہت عام سی بات تھی جسے ہم دونوں بھول گئے ہوں۔ میں کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ میری زندگی کا واحد موقع تھا جب میں مذہب کے خلاف بولتے ہوئے بے اختیار ہوا تھا اور بولتے بولتے زہر اگلنے لگا تھا۔

"مجھے تب بہت عجیب لگا تھا، مجھے لگتا تھا تم غلط ہو، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن پھر میں اس کے بعد چند سال امریکہ میں رہی۔ بلیک امریکنز (سیاہ فام امریکیوں) کے بیچ۔" وہ نہایت آرام سے کہتے کہتے ایک دم جیسے سُن سی ہو گئی تھی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے چہرے کا کوئی تاثر نہیں چھپا سکتی تھی، سوائے خوف کے۔ چاہے وہ سچائی ہو، تکلیف ہو یا پھر خوشی اور اطمینان۔ وہ کھلی کتاب تھی یا شاید میں ایک اچھا قاری تھا۔

"کیا تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے پیاروں کو مرتے دیکھا ہے، اس صورت میں جب وہ بے گناہ ہوں؟ ان کا گناہ ان کی سچائی اور سیاہ رنگ ہو؟" ایک دم جیسے کینے کی تمام گلاس ونڈو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں میں پیوست ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو نہیں ٹپکا تھا، لیکن وہ لال انگارے جیسی ہو گئی تھیں۔

"میں جانتی ہوں اقلیت ہونا کیسے ہوتا ہے۔ چاہے وہ مذہب کی وجہ سے ہو یا پھر رنگ کی وجہ سے۔" وہ ایک دم سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ نہ جانے وہ کیا کہتی تھی، شاید اسے میرا اقلیت ہونا،

میرے مذہب سے بیزاری کی وجہ لگی تھی۔

"لیکن اقلیت ہونا میرا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے مذہب سے اختلاف کچھ اور وجوہات کی وجہ سے ہے جن کو میں ذاتی سمجھتا ہوں۔" میں نے اپنی طرف سے اس کی غلط فہمی مٹانی چاہی تھی۔

"یقیناً تمہاری ذاتی وجوہات ہوں گی، لیکن میں پھر بھی باقی کلاس فیلوز کو اس غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتی۔ آج نہیں کل جب اور فسادات ہوں گے تو نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ انسان بہت کم ذات مخلوق ہے، اسے تخریب کا آلہ بننے کے لیے بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔" اس نے مینیو کارڈ اٹھا کر بہت نارمل انداز میں کہا۔ میں جواب میں کچھ نہیں بولا تھا۔ یقیناً اس کا تجربہ مجھ سے بہت زیادہ تھا۔ میں جتنا انسانوں سے بھاگتا پھرتا تھا، وہ اتنی ہی توانائی سے لوگوں سے ملتی تھی۔

"تم انسانوں کو اپنے مذہب پر عقیدے کی وجہ سے اووائڈ کرتے ہو؟" ویٹر کے جاتے ہی ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے ہوئے اس نے بہت غور اور سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں ایسا کیوں کروں گا؟" میں نے اندر کی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے بظاہر حیرت سے کہا۔

"جب کسی سوال کے جواب میں سوال پوچھا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے، بکواس بند کرو، میں تمہیں جواب نہیں دینا چاہتا۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ جیسے اسے میرے جواب سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"نہیں! میں انسانوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ مجھے بس گھلنا ملنا پسند نہیں ہے۔" میں واقعی اب ہڑبڑا گیا تھا۔

"یا میں بھی باقی کلاس فیلو کی طرح سمجھوں، تمہیں "سیاہ فاموں" کے ساتھ گھلنا ملنا نہیں

پسند؟" اس نے بظاہر مذاق میں بہت بڑی بات اڑادی تھی لیکن وہ عام بات نہیں تھی، ہم دونوں جانتے تھے۔

"مجھے کبھی اس بات نے اثر انداز نہیں کیا ہے کہ کسی کی ہڈیوں پر سفید چمڑا چڑھا ہے یا سیاہ۔ اس چمڑے کے نیچے ہم سب ایک جیسے ہیں۔ ایک ہی پیمانے کے اچھے یا بدنما۔ میں اس کو قدرت کی تقسیم سمجھتا ہوں، مجھے وہ خوبیاں یا صفات متاثر کرتی ہیں جو انسان کی خود کی پیداوار ہو، نہ کہ مفت میں ملی ہوئیں قدرتی چیزیں۔ اور مس صوفیہ الیگزینڈر! میں اپنے عقائد اور اپنے انٹرویو کے علاوہ کسی اور ٹاپک پر بات کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔" آخر میں میں شدید کوفت سے بولا۔ وہ بے جان سے مسکرادی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ہم اس پر بعد میں بات کریں گے، لیکن کیا تم......" ویٹر کے آتے ہی اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ جب تک ویٹر میز پر کھانا لگاتا رہا وہ بہت سنجیدگی سے دور بیٹھے موسیقی والوں کو دیکھتی رہی۔ ویٹر جانے لگا تو اس نے اشارے سے اس کو روکا۔

"اسملو آف ٹین سپرٹ پلیز۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ وہ کسی انگریزی گانے کا نام تھا، شاید وہ موسیقی بدلوانا چاہتی تھی۔ میری سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے تفصیلی جواب دیا۔

"کہتے ہیں مانوس موسیقی اور خوشبو ان جگہوں یا واقعات کو یاد دلاتی ہے جن سے انسان کسی دور میں گزرا ہو، میں نئی جگہ پر نئے لوگوں سے ملنے کے لیے موسیقی اور خوشبو بدلتی رہتی ہوں تاکہ جب میں ان سے دور ہوں تو ان دنوں کو دوبارہ محسوس کرنے کے لیے اسی موسیقی یا خوشبو کا استعمال کروں۔"

شاید وہ ناسٹلجیا کی بات کر رہی تھی۔ خیر میں نہیں سمجھا تھا کہ اس نے کیا کہا لیکن اس کی

فرمائش پر گانا بدلوا دیا گیا تھا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کیا تم مجھ سے دوستی کرو گے؟" چکن اسٹیک کو اپنی پلیٹ میں رکھتے اس نے جیسے پیشکش کی۔ جیسے کوئی ملکہ بہت شان سے کسی ادنیٰ غلام کو اپنے کارواں میں شامل کرنے کی پیشکش کرتی ہے۔ میں نے منہ تک لے جاتے ہوئے کانٹے والے ہاتھ کو روک کر اسے دیکھا۔ وہ ہنس دی۔

"اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو تم؟ کیا تمہیں لگتا ہے میں ایسے ہی شوقیہ سب کے ساتھ یوں کیفے میں بیٹھ کر لنچ کرتی ہوں؟ میں دوستی کے معاملے میں بہت حساس ہوں، اور میں اپنی زندگی میں پہلی دفعہ کسی ایسے سفید فام سے ملی ہوں جو اچھا پسند نہیں ہے۔"

میں جز بز ہوا۔

"لیکن میں دوستی نہیں کرنا چاہتا، نہ تم سے نہ کسی اور سے۔ مجھے لگتا ہے دوست آپ کی ذاتی زندگی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔ آپ کو ہمیشہ ان کو اپنے نظریات کا جواب دہ ہونا ہوتا ہے۔ میں اپنی ذاتی زندگی میں کسی کا حد سے زیادہ انوالو ہونا پسند نہیں کرتا۔" میں بہت صاف گوئی سے بولا۔ اس کی مسکراہٹ گھٹی، وہ تلخی سے بولی۔

"یہ کہاں پڑھ لیا ہے تم نے کہ دوست ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے والوں کو کہتے ہیں؟ دوست تو ہوتے ہی آپ کو اپنے مختلف نظریات کے ساتھ قبول کرنے والے۔ آپ کو اسپیس دینے والے۔ یہ ہر معاملے میں ٹانگ اڑا کر اپنی مرضی مسلط کرنے والے تو دوست نہیں ٹاکسک (نقصان دہ زہریلے) انسان ہوتے ہیں۔ اچھا دوست وہ نہیں ہوتا جو آپ کو یہ بتائے کہ تم نے یہ یہ غلط کیا ہے، اچھا دوست تو وہ ہوتا ہے جو آپ کو بتائے کہ یہ اگر غلط ہے تو کیوں ہے اور اس میں تمہارا نقصان کیوں ہے؟ تم نارسسٹ لوگوں کو کبھی دوست نہیں کہہ سکتے۔"

اسے جیسے میری باتیں ناراض کر گئی تھیں۔ پھر جیسے اس نے خود کو کمپوز کیا۔

"ابھی تم نے کہا کہ تم انسانوں کو اوا ئیڈ نہیں کرتے، بے فکر رہو میں تمہارے خیالات اور نظریات کو تمہاری ذاتی زندگی سمجھتی ہوں۔ مذہب کو ڈسکس کرنا اگر تمہارے لیے اتنا ذاتی معاملہ ہے تو میں اس کا تذکرہ کرنے پر پشیمان ہوں۔"

ہلکی سی موسیقی کی دھن میں، میں نے بہت غور سے اسے دیکھا، وہ اب بہت معروف سے انداز میں پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا نا، وہ کوئی تاثر چھپا نہیں سکتی تھی۔

آہ۔ رکیں مجھے کچھ دیر سانس لینے دیں۔ میں نے آپ کو یہ بھی بتایا نا میں اکثر بات کرتے کرتے بھول جاتا ہوں، پھر مجھے سر جھٹکنا پڑتا ہے۔

خیر! آپ کو اب تک معلوم تو ہو ہی گیا ہوگا۔ تو میں کہہ رہا تھا، چکن اسٹیک کھاتے ہوئے اس بے حد سیاہ چہرے پر مجھے شاید رشک آیا تھا۔ ہاں وہ رشک ہی تھا۔ میں نے سنا تھا جو لوگ زیادہ بولتے ہیں ان کی سوچ بہت سطحی ہوتی ہے، وہ انسانوں کو، ان کے جذبات کو کبھی نہیں سمجھ پاتے۔ میں پہلی دفعہ ایک ایسے انسان سے ملا تھا جو بولتے بولتے انسانوں پر نظر مرکوز رکھتے ہوئے ان کے چہرے سے ان کی دلی کیفیات کا باریک بینی سے جائزہ لیتی ہے۔ وہ اتنی بے نیازی کے باوجود میری ذہنی خلش کو الفاظ دے رہی تھی۔ جیسے اس نے میرا بہت گہرا مطالعہ کیا ہو، شاید انسان جو ہوتے ہیں، وہ نظر کبھی نہیں آتے۔ نہ خیالات سے، نہ اعمال سے۔

مدہم موسیقی کی دھن میں، چھری کانٹے کی پلیٹ سے ٹکراتے ہوئے ہلکی سی کھنک میں، میں نے خود کو کہتے سنا۔

"ٹھیک ہے پھر کیوں نا یورپ اور افریقہ کی دوستی کا انتخابی نشان کا تعین بھی ہم آج ہی طے کر لیں؟"

میں خوش مزاج کبھی بھی نہیں تھا، لیکن شاید یہ خوش مزاجی بھی انسان کے سوشل ہونے سے جنم لیتی ہے۔ انسانی ارتقاء کے لیے لازم ہے کہ وہ انسانوں سے تعلق رکھے، ورنہ یہ نسل کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ مسکرائی۔ اس کے سفید دانتوں کی چمک نظر آئی۔

"بالکل، اور اس کا مطلب ہے کہ بل تم پے کرو گے۔ آخر ایک خوبصورت دوست بل پے کرتے ہوئے اچھی لگے گی کیا؟" اس نے بات بدلنے کے لیے کہا۔ وہ شاید مزید سنجیدہ گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اس دن کے بعد ہم اچھے دوست بن گئے تھے۔ اچھے دوست کا مطلب وہ نہیں ہے کہ ہم چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے، اکٹھے کھاتے پیتے اور یونیورسٹی کا ٹور لگاتے۔ نہیں...... اچھے دوست کا مطلب تھا، ہم دونوں اگر ہفتے میں ایک دفعہ بھی ملتے تو کبھی گلہ شکوہ نہیں کرتے۔ نہ وہ مجھ سے یہ پوچھتی کہ میں نے اتنے عرصے میں اسے کال کیوں نہیں کی، اور اگر کی بھی تو اس کو اپنے اہم پراجیکٹس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ اسی طرح نہ میں اس سے شکوہ کرتا کہ گروپ پراجیکٹ میں میرے بجائے کسی اور کے ساتھ شمولیت کیوں اختیار کی یا پھر کسی اور دوست کے ساتھ ہوتے ہوئے مجھ سے صرف ہائے ہیلو پر اکتفا کیوں کیا؟ نہ مجھے توجہ کی خواہش تھی نہ اسے۔

لیکن پھر بھی میں خوش تھا۔ شاید ارسطو نے انسان کو سماجی جانور یوں ہی نہیں کہا۔ اچھے دوست اپنی اپنی کہانیوں میں خوش رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے غم میں اپنی کہانی لے کر نہیں بیٹھ جاتے۔ نہ ہی یہ تاثر دیتے ہیں کہ آپ کی تکلیف کم اور ہماری زیادہ ہے۔ اچھا دوست آپ کو روتے دیکھ کر آپ سے وجہ نہیں پوچھتا۔ وہ آپ کو رونے دیتا ہے، آنسو ضبط کرنے کا کہہ کر اندر ہی جمع کرنے نہیں دیتا۔ وہ آپ کو روتے دیکھ کر اس وقت نظر انداز کر دیتا ہے۔ رونے

کے بعد وہ آپ کو اپنے ساتھ لمبی واک پر لے جاتا ہے، اور اس دوران آپ کے رونے کے علاوہ ہر موضوع پر بات کرتا ہے۔

اچھے دوست آپ کے پیروں کی بیڑی نہیں بنتے۔ کبھی پرندوں کو دیکھا ہے آپ نے؟ اڑتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو زبردستی اپنے مدار میں گھسنے کے لئے نہیں کہتے۔ وہ اپنے مدار میں رہتے ہیں، لیکن جب کسی ایک کو تکلیف ہو، تو سارے اس ایک کے لیے اپنی پرواز سے نیچے اتر آتے ہیں۔ یہ سب میں نے صوفیا الیگزینڈر سے دوستی کے بعد جانا تھا۔

کبھی کبھار ہم کوئی لنچ ساتھ کر لیتے تھے۔ جہاں ہم چھوٹی موٹی اسائنمنٹ پر تبصرہ کرتے، آس پاس کے موضوع، جرنلزم پر بات کرتے اور پھر ہاتھ جھاڑ کر اٹھ جاتے تھے۔ ایسی ملاقات مہینے میں دو چار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

آپ کو شاید عجیب لگے لیکن ایسا ہی تھا۔ ہم آزاد معاشرے کی پیداوار تھے۔ ہماری ترجیحات توجہ لینے کے لیے دوستی کرنا نہیں تھی۔ اور ہاں آپ کہیں گے کہ دو مختلف اصناف میں دوستی کیسے ہو سکتی ہے آخر؟ تو خدارا میرا خدا ناتجے۔

ہاں تو میں آپ کو صوفیہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔

ایک دفعہ اسی طرح کی ملاقات میں اس نے ویسے ہی چھیڑا۔ مجھے یاد ہے وہ ایک پارک تھا، ہم لان میں بیٹھے تھے۔ وہ مجھے ییلو جرنلزم (لفافہ صحافت) کے متعلق بتا رہی تھی۔ وہ شاید کچھ نوٹس بھی بنا کر لائی تھی۔

ہم گھاس پر بیٹھے تھے جس پر چند کتابیں پھیلی ہوئی تھیں، میں اس کو سن رہا تھا جو اپنے نکات واضح انداز میں سامنے رکھ رہی تھی۔ جب بھی دو ایسے لوگوں کی آپس میں دوستی ہوتی ہے جن کا مشغلہ، شوق، اوڑھنا بچھونا ایک ہی ہو، تو وہ بہت طاقت سے بحث کرتے ہیں۔

”جیسے دوسری جنگِ عظیم کے دوران بھی یوں ہی ہوا تھا، رائی کا پہاڑ بنا دیا جاتا تھا، سچ کو جھوٹ کے ساتھ ملایا جاتا تھا، تا کہ ہر خبر کے ساتھ مرچ مسالے لگائے جائیں اور آج بھی ڈھکے چھپے انداز میں یوں ہی ہوتا ہے۔“ اس نے جیسے بہت زیادہ جذباتی انداز میں بات شروع کی۔

”بلیک امریکنز اور مذہب کو بھی اس کی آڑ میں ہی بدنام کیا جاتا رہا ہے۔“ وہ بہت جانداری سے بول رہی تھی۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے کس چیز کی تمہید باندھ رہی تھی۔

”سیاہ فاموں کو بھی یوں ہی ٹارچر کیا گیا، عوام خبروں کی گہرائی میں نہیں جاتی، انھیں سرسری خبریں چاہیے ہوتی ہیں۔ شہ سرخی میں چھپی گئی چند باتیں، جہاں آپ کو کسی سے نفرت کرنے کے لیے وجہ مل جائے، اور امریکیوں نے بہت خوبصورتی سے دو وجوہات تراش لی ہیں۔ مذہب اور رنگ۔“ وہ بولتی گئی۔

میں پچھلے دنوں سے تھکاوٹ کا شکار تھا لیکن وہ موضوع واقعی حقیقت پسند تھا۔ تلخ بھی۔ میں نے گردن موڑ کر ٹریک پر نظر مرکوز کی۔ ایک جوان جوڑا شام کی واک کر رہا تھا۔ میں بے اختیار ان کو دیکھنے لگا۔ دونوں نفوس کے قدم ایک ساتھ اٹھتے تھے۔ وہ بہت تیزی سے چل رہے تھے۔

بہت نپے تلے انداز میں جیسے دونوں کی ٹانگوں نے ساتھ قدم اٹھانے کا کوئی عہد کیا تھا، ہمیشہ کے لیے۔ میں بغور ان کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ گول ٹریک پر چلتے میرے پیچھے سے گزر گئے۔ میں نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا ان کے قدموں کا توازن ابھی بھی ویسے ہی ہوگا۔

صوفیا ابھی بھی بہت کچھ بول رہی تھی۔ میں اس کو بھی دلچسپی سے سن رہا تھا۔

"اور تمہیں پتہ ہے کہ جرنلزم میں جس مذہب کو سب سے زیادہ ٹارچ کیا گیا ہے وہ کون سا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا۔

"جس مذہب کو عفریت بنا کر دکھایا گیا ہے، وہ اسلام ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ اس سے خطرہ محسوس کیا جاتا ہے۔"

"مذہب سے بھلا کسی کو کیا نقصان ہو سکتا ہے؟" میں واقعی رنجیدہ ہوا۔

"یہ مذہب کوئی اتنی بڑی وجہ تو نہیں ہے جس سے انسانوں کو کچل دیا جائے۔" میں نے ایک اخبار کے ٹکڑے پر لکھی خبر کو پڑھتے ہوئے سر جھٹکا۔ یہ کون سے ہیومن رائٹس کا ذکر ہو رہا تھا یہاں پر آخر۔

صوفیا الیگزینڈر نے اپنی گود میں رکھے سارے کاغذوں کو سمیٹتے ہوئے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا۔

"تم سے ایک بات پوچھوں؟"

"کیا؟"

"تمہیں واقعی کبھی کسی مذہب میں دلچسپی نہیں ہوئی؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا تھا۔

"نہیں!" میں نے کندھے اچکا کر عام انداز میں انکار کیا۔ یقیناً سچ بھی تھا۔ میں کبھی سچائی سے انکار نہیں کرتا تھا۔ شاید صرف یہی ایک خوبی تھی مجھ میں۔

"کبھی امید ڈھونڈنے کی بھی خواہش نہیں کی؟" اس نے ذرا حیرت سے کہا۔

"امید؟ کیسی امید؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"کبھی بھی کسی غم میں امید۔ کسی خواہش کے پورا ہونے کے لئے امید۔ کسی بھی موقع پر جینے کے لیے امید۔ والٹیئر نے کہا تھا کہ اگر خدا موجود نہیں ہے تو خدا کو ایجاد کرنے کی ضرورت ہے، جینے کی امید کے لئے خدا کا ہونا لازم ہے۔" اس نے جیسے اپنی طرف سے بہت حقیقی دلیل پیش کی تھی۔

"غم...... کس چیز کا غم؟" میں اس سے کہیں زیادہ حیرانی تھا۔ "لیکن مجھے تو کبھی کوئی غم نہیں ہوا۔ کوئی ایسا غم تو بالکل بھی نہیں کہ جس میں مجھے امید ختم ہوتی نظر آئے۔" میری خواہشات بھی کبھی ادھوری نہیں رہی تھیں۔ یا شاید میں نے کچھ لمبا چوڑا پلین کیا ہی نہیں تھا زندگی میں۔

"تمہیں کبھی خدا کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی؟" بہت یاسیت سے اس نے مجھ سے پوچھا۔ نہ جانے کون سی گفتگو کس طرف جا رہی تھی۔

"نہیں، ابھی تک تو بالکل بھی نہیں۔" میں نے کندھے اچکا کر کہا۔ یہ نہیں تھا کہ مجھے اس کی بات سے کوفت ہو رہی تھی، یہ حقیقت تھی کہ مجھے واقعی خدا کے وجود کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کبھی اس طرح سے نہیں سوچا تھا۔

یہ خدا ویسے ہمیں دکھی اور پریشانیوں میں ہی کیوں یاد آتا ہے؟

صوفیہ نے بہت گہرا سانس بھرا۔

"ابھی تک تو نہیں ہے۔ لیکن کیا گارنٹی ہے کہ آگے بھی نہیں ہوگی؟ آرزک، میں سمجھتی ہوں کہ خدا انسان کو اپنی ضرورت محسوس کروانے کے لیے اس کی لگام ضرور کھینچتا ہے۔ جس کو کسی کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خدا ہوتا ہے، اور انسان جب خدا بننے لگے تو اس کو اوقات یاد دلانے کے لیے خدا ضرور نازل ہوتا ہے۔" وہ بہت سنجیدگی اور خلوص سے کہہ رہی تھی۔ میں جانتا تھا۔ جواب میں میرے پاس کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ اس کے پاس خدا پر یقین رکھنے کے لیے

ایک وجہ تھی، اور اس کے لیے وہی کافی تھی۔ میرے پاس خدا کو نہ ماننے کے لیے کوئی وجہ نہیں تھی، پھر بھی میں اس کو نہیں مانتا تھا۔

"میں ایسا نہیں سمجھتا، میں ابھی تک خوش ہوں اپنی زندگی سے، کیا ثبوت ہے کہ میں کل خوش نہیں رہوں گا؟" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اپنے لیے آزمائش نہیں مانگا کرتے آتزک۔ اگر خدا تمہیں ثبوت دینے پر آجائے، تم اپنے لیے موت مانگو گے، اور وہ بھی نہیں آئے گی تمہارے پاس۔" اس نے جیسے مجھے ڈرایا تھا۔

"یقیناً ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن خیر، کیا ہم اس سیلو جز تلزم پر بات کرسکتے ہیں جو درمیان میں ہی کہیں رہ گئی ہے؟" میں نے ڈھلتے سورج کی طرف دیکھا، دیر ہو رہی تھی۔

صوفیہ دوبارہ کتابوں کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر مجھے اپنی ریسرچ کے بارے میں بتانے لگی۔ یہ گفتگو رات تک میرے ذہن میں رہی، اور پھر رات کے ختم ہوتے ہی خود بخود ختم ہو گئی۔ میں بہت کچھ ایسے ہی بھول جایا کرتا تھا۔ بھول جانا ضروری ہوا کرتا ہے۔

زندگی یوں ہی آرام سے گزر رہی تھی۔ یقیناً یہ ایک اچھی بات تھی۔

ایک روز لیکچر ختم ہونے کے بعد میں ہال سے باہر نکل رہا تھا جب صوفیہ الیگزینڈر نے مجھے پیچھے سے پکارا۔ ایک خیر مقدمی مسکراہٹ سے میں نے اسے صبح بخیر کہا۔ ہم چلتے چلتے کالج کی راہداری میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ چند دنوں بعد اسپرنگ بریک ہونے والی تھی، ہمیں ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی میزبانی کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں ہمیں کچھ انتظامات دیکھنے تھے۔ وہ ایک دم کسی کا ذکر کرتے ہوئے عام سے انداز میں بولی۔ "جینی تمہیں کافی پسند کرتی ہے۔"

میں نے حیران انداز میں اس سے پوچھا۔ ”کیا مطلب پسند کرتی ہے۔“

”پسند کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ اس نے مزید حیرت سے پوچھا۔ میں جز بز ہوا۔

”یہ تو تمہیں پتہ ہوگا کیونکہ تم ہی جانتی ہو جینی کو۔“ میں نے کندھے اچکائے۔

جینی ایک نائجیرین سیاہ فام تھی۔ وہ ان دنوں یو سی سی میں مہمان یعنی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کی طرح آئی تھی۔ صوفیہ اور جینی زیادہ تر ساتھ پائی جاتی تھیں، اسی لیے صوفیہ اس کو شاید زیادہ جانتی تھی۔

”پسند کرنا کیا ہوتا ہے بھلا؟ وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے۔“ وہ عام سے انداز میں بولی۔

”وہ تمہاری بہترین دوست ہے اس نے کہا ہے تم سے یہ کہنے کو؟“ مجھے شبہ ہوا۔

”ظاہر ہے بالکل بھی نہیں۔ بہترین دوست کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس کی پیغام رسان بن جاؤں۔ مجھے اس کی باتوں سے اور چند اور اشاروں سے اندازہ ہوا کہ وہ تم سے دوستی کرنا چاہتی ہے۔“ اس نے تفصیل سے بتائی۔ میں ہنس دیا۔

”دوستی تو تم بھی مجھ سے کرنا چاہتی تھی، اب کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں بھی ایک انگریز گورا پسند آ گیا؟“ میں نے بے حد آزاد لہجے میں کہا۔ وہ ہنس دی۔

”کتنی خوش فہمیاں ہیں آخر اس سفید فام گورے کو۔ نہیں اب تم اتنے بھی خوش قسمت نہیں ہو کہ میں اس وجہ سے تمہیں پسند کروں گی۔ ہم دونوں کی وجوہات مختلف ہیں۔“

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں عجیب سے تذبذب میں پوچھ رہا تھا۔ میں لڑکیوں کی سائیکی اور سوچ کے بارے میں کچھ زیادہ خاص نہیں جانتا تھا۔ صوفیہ الیگزینڈر نے مجھے بے حد حیرت سے دیکھا، اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

”تاریخ اس بات کی گواہ رہے گی کہ ایک سفید فام نے نہایت عاجزی کے ساتھ ایک سیاہ

قام سے مستقبل میں کیے جانے والے فیصلے کے لیے رائے پوچھی۔ میں آج ہی پریس میں ریلیز کرواتی ہوں۔" وہ بہت خوش مزاج تھی۔ میں بھی ہنس دیا۔ اس نے ہاتھ سے کاریڈور کی طرف اشارہ کیا، اس کا مطلب تھا ہم چل کر بات کرتے ہیں۔

"جینی میری بہترین دوست ہے، بالکل ایسے ہی جیسے تم ہو۔ میں دونوں کی بھلائی چاہتی ہوں۔ اور اس کے لئے لازم ہے کہ میں جذبات کے بغیر کھری بات کروں، صرف اس لیے مشورہ دے رہی ہوں کہ تمہاری سفید قوم پر احسان عظیم کرنا چاہتی ہوں۔" وہ بہت خوش دلی سے بہت خوبصورت طنز کرتی تھی۔ میں پھر ہنس دیا۔ زیادہ تر ہماری گفتگو اسی طرح سیاہ اور سفید رنگ کا مذاق بناتے گزرتی تھی۔ میں اس سے بات کر کے ریفریش ہو جایا کرتا تھا۔

"دوستی ایک ایسا پہلو ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں چاہتی ہوں تم لوگ اچھے دوست بنو، اس میں میری خوشی اور فائدہ دونوں شامل ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہوں گی کہ یہ دوستی سے آگے بڑھے۔" وہ اب سنجیدہ تھی۔

میں اس سے اپنی دوست کے بارے میں ایسی گفتگو کی امید نہیں رکھتا تھا۔

"مجھے لگتا تھا وہ تمہاری دوست ہے اور تم اس کو سپورٹ کرو گی۔" میں نے کچھ حیرت سے کہا تھا۔

"دوست ہے اسی لیے سپورٹ نہیں کر رہی۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ہم پتھریلی روش پر چل رہے تھے۔ دونوں اطراف میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ گزر رہے تھے۔

"دیکھو آزرک! انسان کو محبت میں بھی پریکٹیکل ہونا چاہیے۔ یہ سولہویں صدی کی عربین نائٹس نہیں چل رہی۔ جینی کا ٹمپرامنٹ اور تمہارے مزاج دونوں کو میں بہت اچھے طریقے سے جانتی ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی تو کیا دو دن بھی نہیں گزار سکو گے۔"

"ایسا بھی کیا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یا تم نہیں چاہتی کہ سیاہ اور سفید کے درمیان ان لاز سسرالی تعلقات پیدا ہوں۔" میں نے اسے چھیڑا۔ وہ ہنسی، سفید دانتوں کی چمک واضح ہوئی۔

"اگر سیاہ تمہارا سسرال ہو گیا تو دیکھ لینا بڑی خاطر مدارت ہو گی تمہاری۔" میں ہنس دیا۔

عموماً بات آئی گئی ہو جایا کرتی تھی لیکن واپسی پر اس نے مجھ سے ایک دفعہ پھر کہا۔

"میں نہیں چاہتی جینی تمہارے لیے کوئی خاص جذبہ محسوس کرنا شروع کر دے۔ مجھے تم دونوں عزیز ہو، وہ حساس بھی ہے اور اس کو ہمیشہ توجہ کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ تم سے وقت کے ساتھ ساتھ ذاتیات میں بھی حصہ مانگے گی، جو اگر کبھی تم نہ دے پائے تو وہ صرف شک ہی نہیں کرے گی بلکہ اپنے عمل سے تمہیں تکلیف بھی پہنچائے گی۔ اس کا زندگی گزارنے کا انداز تم سے بہت مختلف ہے۔ یہ نہیں کہ یہ اس کی برائیاں ہیں، وہ بہت اچھی ہے لیکن تم دونوں ایک مناسب جوڑ نہیں ہو۔" اس نے بہت تفصیل سے کہا۔

"لیکن محبت میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔" میں نے امکان کی بات کی۔

"ایسے رشتے کا کیا فائدہ جہاں کسی کو بدلنے کی ضرورت پڑے۔ اگر تم اس کے لئے خود کو نہیں بدل سکتے تو اس سے بھی امید کیوں رکھو گے؟ میں نہیں مانتی کہ ہم کسی تعلق کی بنیاد کسی کو بدلنے پر رکھیں، چاہے وہ دوستی کا رشتہ ہی کیوں ہو۔ ہم یہ چاہتے ہی کیوں ہیں کہ کوئی انسان پچیس تیس سالوں کی شخصیت کو صرف ہمارے لئے تین چار گھنٹوں میں ایک دم بدل دے۔ ہم خود، جو جیسا ہے، چاہے وہ بدصورت ہے، سیاہ ہے سفید ہے، خود غرض ہے یا سچا اس کو ویسے ہی تسلیم کیوں نہیں کرتے؟؟ اگر تمہارے اور جینی کے معاملے میں مجھے ایک فیصد بھی تبدیلی کا چانس نظر آتا تو میں ضرور تم دونوں کی دوستی خود کرواتی۔ تم بھی کسی کو نہیں بدل سکتے، تم زیادہ تر اپنے بارے میں، اپنے آرام کی سوچ میں ہوتے ہو۔ تمہیں دوسروں کو تسلیم کرنا مشکل لگتا ہے،

اور تمہیں ایسا انسان ہی درکار ہے جس کو فاصلہ دینا آتا ہو۔ تم اور وہ، دونوں اپنے مدار میں اچھے ہو لیکن جب یہ دونوں مدار ایک دوسرے کو کاٹیں گے تو نقصان ہی ہوگا۔ جینی یہ بات نہیں سمجھتی، وہ محبت کو سب کچھ کہتی ہے جبکہ صرف محبت ہی کافی نہیں ہوتی۔ بعد میں ایک دوسرے سے نفرت کرنے سے بہتر یہ نہیں ہے کہ ہم فاصلہ رکھ کر ہی محبت کریں؟" اس نے گویا تقریر کی۔ میں گڑبڑا گیا تھا۔

"تم بہت کڑوا بولتی ہو۔ بولتے بولتے اگلے بندے کو ذبح کر دیتی ہو۔" میں نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"اور ہم دونوں جانتے ہیں میں نے تمہارے بارے میں جو بھی کہا وہ سو فیصد درست ہے۔" اس نے اٹھی گردن سے بے حد اعتماد سے کہا۔ میں ہنس دیا۔

"تم تو بہت جانتی ہو مجھے لگتا ہے تمہیں جینی سے زیادہ مجھ میں دلچسپی ہے، تمہیں کیوں مجھ سے محبت نہیں ہوتی؟" میں نے اسے چھیڑا۔ اس نے ایک ادا سے گھنگھریالے بال جھٹکے۔

"اگر یہ مجھے پرپوز کرنے کی کوئی کوشش تھی تو میں متاثر نہیں ہوئی۔" میں حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اتنا اعتماد ایک سیاہ فام میں؟ یہ نہیں تھا کہ میں اسے حقیر سمجھ رہا تھا، اصل وجہ یہ تھی کہ اتنا اعتماد میں نے کسی سفید فام عورت میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اپنی خوبصورت ماں میں بھی نہیں۔ مجھے رشک آیا تھا۔

"اگر تم چاہتی ہو میں تمہیں پرپوز کروں تو میرے پاس ایکسپریس کرنے کے دلچسپ طریقے بھی موجود ہیں۔" میں نے تنگ کیا۔

"نہیں، تم لیٹ ہو چکے ہو۔ میں پہلے ہی اپنے دل کو کہیں گروی رکھوا چکی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”واقعی؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

جیسے یہ ہم دونوں کی دوستی کا ایک ان کہا اصول تھا کہ ذاتی معاملات میں ہم اتنا ہی انوالو ہوتے تھے جتنا دوسرا فریق شامل کرنا چاہتا۔ اس نے تفصیل نہیں بتائی اور میں نے نہیں پوچھی کیونکہ میں جانتا تھا وہ جب مناسب سمجھے گی مجھے بتا دے گی۔

”چلو دیر ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ جینی تمہاری جاسوسی کے بعد تمہیں قتل کر کے مجھ سے شادی کر لے، واپس چلتے ہیں۔“ میں نے موضوع بدلا تھا۔

اس کے بعد میں نے جینی کی بات پر غور کیا تو مجھے ماننا پڑا وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ساتھ رہ کر نفرت ہو جائے تو کیا اس سے بہتر یہ نہیں کہ دور رہ کر محبت کی جائے؟

چند ہفتوں بعد ہماری سپرنگ بریک ختم ہوئی اور زندگی معمول پر آ گئی۔ میرا زیادہ تر دھیان اپنی پریزنٹیشن اور کتابوں پر ہوتا تھا۔ صوفیہ الیگزینڈر سے اکثر رابطہ ہوتا رہتا تھا، وہ اپنے خاندان والوں سے ملنے کے لیے نیو یارک گئی تھی۔ یہ تو میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے خاندان میں کون کون تھا لیکن واپسی اس کی ایک امریکی کزن کے ساتھ ہوئی تھی۔

میں یہ بھی نہیں جانتا وہ کس لحاظ سے اس کا کزن تھا کیونکہ وہ گورا امریکی تھا، مجھے تجسس تو ہوا تھا لیکن اس تجسس نے مجھے کریدنے پر نہیں اکسایا تھا۔ وہ میری دوست تھی اور میں اسے اسپیس دینا جانتا تھا۔ میں جانتا تھا اچھے دوست آپ پر خود جو ظاہر کرنا چاہیں وہ سن لینا چاہیے، جو چھپانا چاہیں اس کے بارے میں تجسس کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ تعلق کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، اس میں حجاب ہونا لازمی ہے۔ اسی کو پرائیویسی کہتے ہیں، اور آزادی بھی۔

میں مارک سے پہلی دفعہ یونیورسٹی کیفے میں ملا تھا۔ صوفیہ الیگزینڈر نے بہت گرم جوشی

سے اس کا تعارف کرایا تھا۔

"آزریک! یہ مارک ہے، میرا کزن۔ امریکن ایمبیسی میں ہوتا ہے۔" مجھے نہ جانے کیوں سوفیہ الیگزینڈر کی آنکھوں میں کچھ الگ دکھائی دیا تھا۔ کچھ ایسا جو پچھلے چند سالوں میں میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے آنکھیں پڑھنا نہیں آتی تھیں اس لیے میں اس کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔

مارک بہت خوش دلی سے مجھ سے ملا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خوش اخلاقی صرف میرے لئے مختص تھی۔ باقی انسانوں کو وہ انسان نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اپنے چند دن کے قیام میں زیادہ تر اکیلا پایا جاتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس کام سے یہاں آیا تھا لیکن سوفیہ الیگزینڈر اس کو جمائکا گھمانا چاہتی تھی۔

اس پہلی ملاقات کے دو دن بعد سوفیہ الیگزینڈر نے مجھے میسج کیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ شاید کوئی ضروری بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے لنچ کا کہا اور میری توقع کے برعکس وہ اس دن اکیلی تھی۔ مجھے لگا تھا وہ مارک کو ساتھ لائے گی لیکن وہ اکیلی آئی تھی۔ میں نے اسے شاید پہلی دفعہ سنجیدہ دیکھا تھا۔

"کیا تم ٹھیک ہو؟" میں نے اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

ویٹر کے کھانا رکھنے تک میں اور وہ خاموشی سے کیفے کی دیواروں پر لگی پینٹنگز کو گھورتے رہے۔

"تمہیں مارک کیسے لگا؟" ویٹر کے جاتے ہی اس نے پوچھا۔

"تمہارا کزن مارک؟ وہ تو بہت اچھا لگتا ہے۔ کافی خوش اخلاق ہے، لیکن میں ذاتی طور پر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا کیونکہ میں اس سے صرف ایک دفعہ ملا ہوں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ مارک سے وابستہ اس کا تعلق بے حد خاص ہے لیکن کس حیثیت سے خاص ہے؟ کس نوعیت کا تعلق ہے؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ صوفیہ الیگزینڈر نے اسٹرا سے منٹ مارگریٹا کا گھونٹ بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

میں جانتا تھا وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن شاید وہ الفاظ ڈھونڈ رہی ہے اس لیے میں نے یہ تاثر نہیں دیا کہ مجھے کچھ زیادہ تجسس ہے۔ بار بار یہ باور کروانا ضروری نہیں ہوتا کہ آپ اپنے دوست کو سن رہے ہیں۔

"میں مارک کو پسند کرتی ہوں۔" اس نے مخمل پر نظر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے نارمل انداز میں سر ہلایا۔

"مجھے اندازہ ہے۔" میں نے اس کو اعتماد دینے کی کوشش کی۔

"مجھے اس سے محبت ہے لیکن مارک ایسا نہیں سوچتا۔" اس نے کچھ تذبذب سے کہا۔ شاید اسے کوئی ایسا سامع چاہیے تھا جو اس کو جج نہ کرے۔ اسے صرف دھیان سے سنے۔

"کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا؟" میں نے بہت نرم انداز میں پوچھا۔

"یہ میں نہیں جانتی۔ شاید وہ بھی نہیں جانتا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن فی الوقت میرا مسئلہ یہ نہیں ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہی۔

"وہ امریکن ایمبیسی میں انسانی حقوق کے تحفظ کا ترجمان ہے۔ میں اسے یہ کہہ کر ساتھ لے کر آئی تھی کہ وہ ہمارے پراجیکٹ کو یونائیٹڈ نیشنز میں سپورٹ کرے۔"

دراصل ان دنوں صوفیہ چند سیاہ فام امریکیوں اور ادھر جمائکا کے سیاہ فاموں کے ساتھ

ایک پریزنٹیشن تیار کر رہی تھی جسے امریکی میڈیا کی ایک کمپنی سپانسر کرنے کے لیے تیار تھی۔ وہ ورجینیا میں سیاہ فاموں پر ظلم اور امریکی حکومت کے تضادات کو منظر عام پر لانا چاہتی تھی اور اس کے لیے اسے بڑے پیمانے پر سپورٹ کی ضرورت تھی۔ وہ صرف ایک ڈاکومنٹری نہیں چلانا چاہتی تھی بلکہ ایک اسکول آف تھاٹ کو سامنے لانا چاہتی تھی۔ اس کا مقصد ییلو جرنلزم (لفافہ صحافت) سے پردہ اٹھانا تھا۔

میں نے آپ سے کہا تھا نا، میں صحافت پڑھنا چاہتا تھا اور وہ صحافی بننا چاہتی تھی۔ دونوں میں فرق تھا اور ہم سب جانتے تھے ایسا کرنے سے وہ کتنی مصیبتوں کو خود دعوت دے رہی ہے۔

"لیکن مارک ایک ریسسٹ (انتہا پسند) ہے۔" اس نے تفصیلات بتاتے ہوئے آخر میں صرف اتنا کہا تھا کہ میرا منہ تک لے جاتا چمچ رک گیا تھا۔ پہلی دفعہ میرا ردعمل بے ساختہ پن کا شکار تھا۔ مجھے ابھی سارے "مسئلے" کی سمجھ آئی تھی۔

صوفیہ الیگزینڈر سیاہ فام تھی، مارک سفید فام۔ مارک کو سیاہ فاموں سے نفرت تھی۔ اس کی شاید یہ مجبوری تھی کہ اس کے امریکی انکل نے ایک سیاہ فام سے شادی کی اور ان کی اولاد، صوفیہ الیگزینڈر بھی سیاہ فام پیدا ہوئی۔ وہ شاید سیکنڈ کزنز تھے، لیکن صوفیہ کے والدین ایک ایسے ہی "سانحے" میں مارے گئے تھے، جس کی وجہ سے وہ نیویارک میں اپنے رشتے داروں سے کچھ قریب ہوگئی تھی۔

"میں جانتی ہوں، مجھ سے وہ تمام لوگ شدید نفرت کرتے ہیں جو میرے باپ کے رشتہ دار ہیں، وہ سارے گورے امریکی ہیں۔" اس نے اپنی بات کو اس بات پر اختتام کیا۔ میرے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔ مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ صوفیہ الیگزینڈر ایسے خاندان سے

تعلق رکھتی ہے۔

"اگر مارک انتہا پسند ہے تو تمہیں اس سے مدد کی امید ہی کیوں ہے؟ اور تمہیں اس سے محبت کیوں ہے؟" میں نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس سے پوچھا۔ میں نہیں جانتا تھا میرے سوال بچگانہ تھے۔

"وہ ہیومن رائٹس کا عہدیدار ہے، میں چاہتی ہوں وہ صرف انسانیت کو سپورٹ کرے کسی کالے یا سفید کو نہیں۔ اور محبت؟" وہ ہنسی۔ سفید دانت واضح ہوئے تھے۔

"اسی لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ جینی اور تمہاری دوستی ہو۔ یہ جو دوستی ہوتی ہے، یہ بہت گہرائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ انسان کو واپس پلٹنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ مجھے تجربہ ہے اس بات کا۔ اسی لیے میں نے اس دن کہا تھا کہ قریب ہو کر ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ محبت لاحاصل رہے۔ دور رہ کر محبت کی جائے۔"

میں کچھ کچھ اس کی باتیں سمجھنے لگا تھا۔ یہ ہر بات سمجھانے کے لیے قدرت مثال ہی کیوں سامنے لے کر آتی ہے؟ بغیر مثال اور تجربے کے کھلی باتیں سمجھ کیوں نہیں آتیں؟

"تم مارک سے اظہار کر چکی ہو؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس نے جواب میں سوال پوچھا۔

"میں جس صوفیہ کو جانتا ہوں وہ کسی بھی رشتے میں، یہاں تک کہ محبت میں بھی بھیک مانگنے کی قائل نہیں ہے۔" میں نے واضح طور پر اس کی تعریف کی۔ حسب معمول بات کو مذاق میں اڑانے کے بجائے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں محبت میں اندھا ہونے کو محبت ہی نہیں سمجھتی ہوں۔ مجھے اس کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے لیکن میں زیادہ الو نہیں ہونا چاہتی۔ فی الحال مجھے ایک بہت بڑا صحافی بننا ہے۔

سچ بولنے والا صحافی جس کو کوئی خوفزدہ نہ کر سکے۔ محبت کو کھو دینے کا خوف بھی نہیں۔" اس کی آنکھیں ہر طرح کے تاثرات سے خالی تھیں۔ مجھے ایک لمحے کو اپنی ماں یاد آئی۔ کیا وہ بھی اسی مصمم ارادے کی عورت تھی؟ میں اپنی زندگی میں بہت کم ایسی عورتوں سے ملا ہوں، جنہوں نے محبت میں خود کو ضائع کرنے کے بجائے، خود کو برف بنا لیا۔ مجھے صوفیہ الیگزینڈر بھی برف کی سِل ہی لگی۔ ٹھنڈی اور بے جان۔

مجھے یہ بات سمجھنے میں بہت عرصہ لگا کہ جس لمحے انسان نے اپنی خواہش پر قابو پالیا، ایک لمحے میں سب کچھ بدل گیا۔ ترجیحات، گلے شکوے، شکایتیں، سب کچھ بدل جاتا ہے۔ جس لمحے انسان احساسات پر قابو پالے، سب کچھ بے معانی ہو جاتا ہے، تب تکالیف اثر کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہ سب تب ہوتا ہے جب زندگی میں خواہش کی پیروی کے علاوہ اور بھی بہت ضروری کام ہوں۔

"تمہیں یاد ہے تم نے کہا تھا کہ محبت میں انسان کو بدلا جا سکتا ہے؟" اس نے اسپرنگ بریک سے پہلے کی گئی بات کی طرف اشارہ کیا۔

"شاید ایسا ہوتا ہو، لیکن جب میں کسی کے لیے خود کو بدلنا نہیں چاہتی تو پھر دوسرے کو کیوں بدلوں۔ مارک دبے الفاظ میں مجھے کل سے دو دفعہ کہہ چکا ہے کہ میں اس ڈاکومنٹری کو لیڈ نہ کروں کیونکہ یہ وقت کا ضیاع ہے۔ میں صرف اس لیے کہ وہ محبوب ہے، اس کے کہنے پر اپنے خوابوں سے دستبرداری اختیار نہیں کر سکتی، یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلط ہے۔ اسی طرح نہ ہی میں اسے مجبور کر سکتی ہوں کسی کام کے لیے۔ محبت میں آنکھیں بند کر کے خود کو رول دینے کے بعد، محبوب کو برا بھلا کہنا صرف خود ترسی اور بلیم گیم ہے۔ مارک برا نہیں ہے، بالکل ویسے ہی جیسے میں بری نہیں ہوں۔ بس ہماری موجودگی اور ملاقات غلط حالات میں ہوئی ہے اور ہمیں

اس کو حقیقت پسندی کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے۔" وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ مجھ سے اس کا یہ روپ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ شاید عورت کا مضبوط کردار مرد سے کبھی بھی ہضم نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ میں جانتا تھا میری ساری دلیلیں اس کے سامنے بے معانی ہوں گی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم اٹھنے والے تھے کہ موسیقی بدل گئی۔ ہم اٹھ ہی رہے تھے کہ ریستوران کی موسیقی انتظامیہ نے اتفاقاً وہی امریکی گانا "اسمیلز لائک ٹین اسپرٹ" چلایا۔ ہم دونوں کسی معمول کے انداز میں واپس بیٹھ گئے۔ میں نے اتنی دیر میں پہلی دفعہ صوفیہ الیگزینڈر کو اپنی جاندار مسکراہٹ اوڑھتے ہوئے دیکھا۔

میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بولی۔ "کچھ یاد آیا؟"

میں ہنسا۔

"اب میں سمجھا تم کیوں ہر نئی ملاقات کے لیے خوشبو اور گانے بدلتی ہو۔"

"یہ سن کر جاتے ہیں۔" اس نے دھیمی مسکراہٹ سے کہا۔ میں نے ان چند لمحوں میں سالوں پہلے کی ہماری پہلی ملاقات کو محسوس کیا تھا۔ ہم جب اٹھ کر ریستوران سے باہر نکلے تو میں نے اس سے پوچھا۔

"صوفیہ! اگر محبوب سفید ہو تو محبوب کیسا لگتا ہے؟"

وہ مسکرائی۔

"محبوب سفید ہو تو ہر سفید سے محبت ہو جاتی ہے۔ پھر چاہے وہ موت ہی کیوں نہ ہو۔"

اس کی آنکھوں میں مجھے سفید موت سی نظر آئی تھی۔

"اور اگر سیاہ ہو؟" میں نے بے ارادہ پوچھا۔

"محبوب سیاہ کب ہوتا ہے آرزک؟" اس نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا، پھر وہ بولی۔ "اگر

محبوب سیاہ لگنے لگے تو دل کرتا ہے دنیا کی ہر شے سیاہ ہو جائے، بادل، آسمان، برف، یہاں تک کہ امن کے جھنڈے پر موجود سفید کبوتر بھی۔"

میں خاموش ہو گیا تھا۔ مجھے ایکدم اس پر ترس بھی آیا اور رشک بھی۔ ترس اس لیے کہ زندگی سے بھرپور وہ لڑکی کم از کم اتنی مشکلات کی حقدار تو نہ تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اچھی لگتی تھی، لاپرواہ انداز میں کندھے اچکا کر بے نیازی، یا پھر چلتے پھرتے کسی شناسا چہرے پر کوئی شگوفہ کر دینے والا تبصرہ اچھالنے والی کہ دیر تک سننے والا کوفت بھلائے خوشگوار سی پھوار محسوس کرے۔ اور رشک اس لیے کہ وہ بہت مضبوط تھی، اسے ایک اچھا صحافی بننا تھا۔ وہ مجھے اب تک ملنے والے سب انسانوں سے زیادہ اچھا انسان لگی تھی۔

جانے کیوں ہمیں صرف مسکراہٹوں والے چہرے ہی چاہیے ہوتے ہیں۔ ہم خود سارا دن روتے رہیں، لیکن ملنے والا کبھی کوئی کہانی نہ سنائے۔ بس خاموشی اور توجہ سے ہمارا درد سنیں۔ صوفیہ الیگزینڈر کا چہرہ بھی ان ہی چہروں میں سے تھا جسے میں صرف سامع کی طور پر دیکھنا چاہتا تھا، اداس اور مایوس نہیں۔

ہم وہاں سے اٹھے اور میں پہلی دفعہ صوفیہ کے پاس سے بوجھل قدموں سے واپس پلٹا تھا۔

شام کو مجھے پارک کے ایک کیفے میں مارک نظر آیا، وہ شاید کچھ خریدنے آیا تھا۔ اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ بہت گرم جوشی سے میرے سامنے آیا۔

"ہائے آئزک، لانگ ٹائم!"

میں نے سنجیدگی سے سر ہلا کر جواب دیا۔

"کیا ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟" میں نے مٹھیاں بھینچیں۔ مجھے ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر

بات کرنا اچھا نہیں لگتا تھا جو مجھے پسند نہیں ہوتے تھے۔ لیکن میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ابتدائی باتوں کے بعد وہ بولا۔

"میں کافی دنوں سے تم سے بات کرنا چاہتا تھا، اصل میں صوفیہ الیگزینڈر کے پراجیکٹ کے سلسلے میں۔"

میں چونکا۔

"کیسی بات؟"

"میں جانتا ہوں تم دونوں اچھے دوست ہو، تم مجھے سمجھدار دکھتے ہو۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم صوفیہ کو سمجھاؤ۔ وہ تمہاری بات سمجھے گی۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے وضاحت کی۔

"وہ چاہتی ہے میں مگرمچھوں کے تالاب میں رہ کر مگرمچھوں سے الجھوں۔ اس کے پراجیکٹ کو بین الاقوامی سطح پر پیش کرنا میرے لئے بے حد نقصان دہ ہے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھ رہی، وہ مجھ سے ناراض ہے۔"

میں نے اسے ایک نظر دیکھا۔ "میں صوفیہ کو سالوں سے جانتا ہوں اور میں یہ دعوے سے کہتا ہوں کہ صوفیہ الیگزینڈر کبھی کسی کو کچھ کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔ وہ حالات سمجھتی ہے اور میں جانتا ہوں وہ کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔" میں نے ایک اچھا دوست ہونے کا حق ادا کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔ وہ جو بھی کر رہی ہے، وہ انسانیت کے جذبے کا نتیجہ ہے، لیکن اگر وہ سیاہ فاموں کے لئے کچھ کرنا ہی چاہتی ہے تو وہ یہ سب امریکیوں کو نشانہ بنائے بغیر بھی کر سکتی ہے۔" میں نے مارک کی باتوں سے امریکی حب الوطنی کی بو محسوس کی تھی۔ صوفیہ کی باتیں

حیران کن نہیں تھیں اب۔

"ییلو جرنلزم کے بارے میں تو یقیناً جانتے ہوں گے آپ؟" میں نے قدرے ترش انداز میں اس سے پوچھا۔

"لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جب سب ہی غلط ہیں تو ٹھیک کی کون سنے گا۔ نیلسن منڈیلا نے بھی صرف عوام کو مشتعل کیا اور اب ایسی ڈاکومینٹریز سے جب عوام احتجاج شروع کرے گی تو بدامنی پھیلے گی۔ ہر جگہ جذباتی پن نہیں دکھانا ہوتا۔ بعض اوقات مصالحت پر راضی ہو جانا چاہیے۔"

مجھے اس کی ایسی "صاف گوئی" پر کافی حیرت ہوئی۔

"نیلسن منڈیلا نے سیاہ فاموں کو شعور دیا ہے۔ یہ کون سا امن ہے جہاں سچ بولنے پر پابندی لگائی جاتی ہو، جذباتی پن کو میں منافقت سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ وہ اتنا فہم رکھتی ہے کہ کس مدد کی کیا نوعیت ہے۔" میں نے کچھ سخت انداز میں کہا۔

"اگر تم نے اس کے پراجیکٹ کو امریکی میڈیا پر نشر کرنے سے روکنے میں میری مدد کی تو میں ایجنسی سے تمہیں اتنی امداد فراہم کر سکتا ہوں کہ تم ساری زندگی کے لئے بے فکر ہو سکتے ہو۔" اس نے جیسے کاروباری انداز میں میری وفاداری کی بولی لگائی تھی۔ اب مجھے اس "مصالحت" کی سمجھ آئی تھی۔ صوفیہ نے اپنا سب کچھ کھو یا تھا۔ ماں باپ اور رشتوں کے علاوہ انسان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے؟ اور وہ سفید فام اس کی سچائی کی قیمت لگا کر اس کو مصلحت کہہ رہا تھا۔ انسانی جان کی قیمت چند چیک تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ وہ آخری چیز بھی نہیں تھی جس کا میں تصور کر سکتا تھا۔

”کیا میں تمہیں بکاؤ مال لگتا ہوں؟“ میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

”تم نے ابھی صوفیہ کی اس پریزنٹیشن کے نکات نہیں دیکھے۔ اس میں ایک انتہا پسند مذہب کے حوالہ جات ہیں، میری پوری ایجنسی بھی اس کو سپورٹ نہیں کرے گی اور پرائیویٹ میڈیا کو اور چاہیے ہی کیا ہوتا ہے؟ مرچ مسالے دار خبریں۔ تم نہیں سمجھ سکتے کتنی بڑی مشکل ہو جائے گی، دنیا بھر میں اس مذہب کے پیروکار امریکی حکومت پر لعنت بھیجیں گے۔“

”لیکن ڈرنا تو ان کو چاہیے جن کی ساکھ تباہ ہونے کا خدشہ ہے، یا میں بھی یہ سمجھوں کہ تم ایک سفید فام انتہا پسند امریکی گورے ہو جس کو سیاہ فاموں سے شدید نفرت ہے۔“ میں نے قدرے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ وہ بے ساختہ کھڑا ہوا۔

”میں سمجھتا تھا تم عقلمند ہو گے لیکن افسوس کے ساتھ، صوفیہ سارے دوست اپنے جیسے بناتی ہے۔ میں اس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا، چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا ہو۔ اگر تم صوفیہ کو اچھی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو، اور اپنی دوست کو بچانا چاہتے ہو تو اس کو منع ضرور کرنا۔“ وہ جس گرمجوشی سے مجھ سے ملا تھا وہ اب اس کے چہرے سے غائب تھی۔

صوفیہ نے مجھے یہ سب نہیں بتایا تھا، اس نے سرسری انداز میں مارک کی فطرت کا ذکر کیا تھا لیکن میں سمجھا تھا کہ عام سی بات ہو گی، مارک اگر مجھ جیسے ایک اجنبی سے اتنا گھناؤنا انداز اختیار کر سکتا تھا تو پھر صوفیہ کو تو واضح منع کرتا ہو گا۔ مجھے پہلی دفعہ معاملات کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔

چند دن تک میں صوفیہ سے رابطے میں رہا، وہ بہت مصروف تھی، اس پر کام کا بوجھ بھی تھا اور تھکانے والی صورتحال بھی۔ ہمارا آخری امتحان ہو چکا تھا، لیکن ریسرچ کا کام جمع کروانا رہتا تھا اور صوفیہ نے بہت اونچی جگہ ہاتھ مارا تھا۔

چند دن بعد اس نے مجھے بہت خوشی سے بتایا کہ اسے نیو یارک ٹائمز کے ایک شو کی میزبانی کی آفر موصول ہوئی ہے۔ صوفیہ بہت خوش تھی، میں نے آپ سے کہا تھا نا اس سے اپنے تاثرات نہیں چھپائے جاتے تھے۔

''مجھے ایک سچا جرنلسٹ بننا تھا آرزک، جو کسی چیز سے نہ ڈرے، جو سچ کو سچ کہے چاہے وہ اس کی اپنی ذات کے خلاف ہو، میں ابھی تک ایک سٹوڈنٹ تھی، لیکن ابھی میں ایک ایسی پوسٹ پر کام کرنے والی ہوں جہاں میری آواز لاکھوں لوگوں کی آواز بنے گی۔''

میں مسکرا دیا، مجھے اس کو خوش دیکھ کر بہت حوصلہ ہوا تھا۔ دوست خوش ہو تو انسان کی اپنے رگوں میں اطمینان کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی محسوس کیا ہے؟

میں نے مارک کی باتیں صوفیہ کو نہیں بتائیں، میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، نہ ہی اس کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں مارک کے خیالات سے آشنا ہوں۔ مجھے معلوم تھا مارک صوفیہ سے نفرت کرتا ہوگا۔ میں صوفیہ کو اپنے سامنے نفرت کا شکار نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''تو کب جا رہی ہو لیڈی جرنلسٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس ویک اینڈ پر، ٹاک شو ہر جمعرات کو رات نو بجے کو ہوگا، مجھے ٹی وی پر ضرور دیکھنا۔ میں بھی وہاں سے تمہیں آپ کا اشارہ کروں گی۔'' اس نے چینل اور شو کا نام لے کر بچوں کی سی خوشی میں کہا۔ میں ہنس پڑا تھا۔

دو دن بعد ہی ویک اینڈ تھا، اس نے اگلے دن مجھے اور جینی کو بلا کر اپنے تمام نکات اور پریزنٹیشن کی تفصیلات سمجھائیں اور بتایا کہ وہ اس کی چار سالوں کی ریسرچ ہے۔ ڈاکومنٹری کی شوٹنگ اور پریزنٹیشن سب کچھ وہ اور اس کی ٹیم کر چکی تھی، اسے ہم سے رائے چاہیے تھی۔

جس دن اس کی فلائٹ تھی اسی روز اس کو ان سارے بلیو پرنٹس کے جملہ حقوق اس پرائیویٹ

کمپنی کے نام کرنے تھے۔

"بس ایک آخری کام رہتا ہے، یہ تم دونوں دیکھو اور مجھے ایک نقاد کی حیثیت سے مشورہ دو۔" اس نے کچھ کاغذات کی فائل، اور ایک یو ایس بی ہمارے حوالے کی تھی۔ میں نے جینی سے کہا کہ میں کل اس کے ساتھ کسی وقت مل کر دیکھ لوں گا، کیونکہ ابھی صوفیہ کے جانے میں دو دن کا وقت تھا۔

اس رات میں نے صوفیہ کی تمام ریسرچ خود پڑھی۔ میں صبح تک ایک ایک صفحہ پلٹتا رہا، اور حیرت سے ایک ایک صفحے کو گھنٹوں بار بار پڑھتا رہا۔ اس میں پچھلے چار سالوں میں یورپ امریکہ میں ہر اس کیس کا ذکر تھا جو بین الاقوامی اور مقامی سطح پر پیش آیا تھا۔

قرآن بے حرمتی سے لے کر فرانس میں مسلمان عورتوں کے لباس پر اعتراض کے سانحے، سیاہ فاموں پر حملے کے بعد اس کو ڈھکے چھپے الفاظ میں سامنے پیش کرنے کی شہ سرخیاں، اس میں کیا کیا نہیں تھا۔

یہ سب خبریں میری نظروں سے بھی گزرتی تھیں، لیکن میں ان کو بیچ سمجھ کر کچھ دیر کے تاسف کے بعد بھول جاتا تھا، مجھے اس ریسرچ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ مذہب، رنگ، نسل کے تفرقے میں کتنی نفرت کو چھپا کر رکھا گیا ہے۔ ان چند فائلوں میں ہر کیس اس بات کی تائید کرتا تھا کہ جھوٹی خبروں کے باعث تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر کیا مغالطے موجود ہیں۔ بے بنیاد خبریں، جن کی چھان بین شاید ہی کوئی کرتا ہو، وہ اس طرح سے عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت پھیلا رہی تھیں کہ حکومتی سطح پر کچھ کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

اس سب میں سب سے زیادہ نقصان مذہب اور سیاہ فاموں کو ہوا تھا۔ جو مذہب اس کا

شکار تھا، وہ اسلام تھا۔ مجھے مذہب میں دلچسپی نہیں تھی لیکن میرا روز مرتے انسانوں سے انسانیت کا تعلق ضرور تھا۔ میرے دل میں مذہب کی شناخت اور اس کے اس تفرقے کی وجہ سے مذہب سے بیزاری اور پختہ ہوگئی۔ نہ یہ تفریق ہوتی، نہ کوئی کسی مذہب کا پرچار کرتا، نہ لوگ مرتے اور نہ ہی انسانیت پامال ہوتی۔

وہ فائلز واپس پڑھتے پڑھتے صبح ہو چکی تھی، میں نے ڈاکومنٹری فلم اگلے دن دیکھنے کا ارادہ کیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ موبائل اسکرین کی چمکتی روشنی کو میں نے بہت مشکل سے دیکھا، بند ہوتی آنکھوں سے میں نے کال اٹینڈ کی تو وہ جینی تھی۔

اگلے ہی لمحے میری آنکھیں پٹ سے کھلی تھیں۔ لمحہ پہلے والی غنودگی جیسے کہیں غائب ہوگئی تھی۔ میں نے ٹھیک دس منٹ بعد خود کو اکھڑتی سانسوں کے ساتھ یونیورسٹی روڈ پر موجود ایک ریستوران کے باہر پایا تھا۔

☆......☆......☆

مجھے نہیں معلوم وہ کیا تھا؟ شاید وہ اس پرفیوم کی ٹوٹی بوتل کی مہک تھی جو دحشت ناک تھی۔ یا پھر کچھ اور تھا۔

ہاں۔ وہ سیکریٹ نامی پرفیوم کی شیشی تھی، جو وہاں قدم رکھنے پر میرے واش روم سلیپرز کے نیچے مجھے محسوس ہوئی تھی۔ میری نظریں اس پرفیوم کی بوتل پر ٹکیں تو میں نے خوشبو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ وہ خوشبو نہیں تھی۔ اس دن کے بعد میرے لئے وہ خوشبو نہیں جلتے انگارے کی جلتی مہک بن گئی تھی۔

میں اس وقت ریستوران کے ایک کمرے میں موجود تھا۔ میرے آس پاس ہوٹل کے ویٹر، منیجر اور نہ جانے کون کون تھے۔ مجھے جینی نے میرے اپارٹمنٹ سے چند گلیاں چھوڑ کر

ایک ریستوران کا نام بتایا تھا اور میں نہ جانے وہاں کیسے پہنچا تھا، لیکن میں پہنچ گیا تھا۔

میری نظر پرفیوم کی بوتل سے ہوتے ہوئے چند پلاسٹک کے ٹکڑوں پر پڑی۔ وہ پلاسٹک کے لمبے سے شفاف ٹکڑے لگتے تھے، لیکن ان کے آخری سرے پر کچھ کچے گوشت کے ذرے اور جما ہوا خون لگا ہوا تھا۔ اگر جینی اسی وقت داخل ہو کر ان میں سے چند ٹکڑوں پر لگے کیوٹکس نہ پہچان لیتی تو میں شاید ان کو ناخن نہیں پلاسٹک ہی سمجھتا۔

سیکرٹ پرفیوم کی خوشبو اور وحشت ناک ہو گئی۔ میں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ منظر میرے سمیت نہ جانے کتنے یونیورسٹی طلباء کو زندگی بھر ٹراما میں لے جانے کا ہتھیار بن گیا تھا۔

وہ ایک ہوٹل کا کمرہ تھا لیکن وہاں چاروں طرف بہت صفائی سے کسی کے وجود کے حصے رکھے گئے تھے۔ سامنے سینٹرل ٹیبل پر بے دردی سے کھینچے گئے ناخن جن پر لگے گوشت کے ریشے گلنے کے قریب تھے، درمیانی صوفے پر گھنگریالے بال لٹوں کی شکل میں موجود تھے، اور بیڈ پر چند کٹی ہوئی انگلیاں۔

آہ۔۔۔رکیں مجھے سانس لینے دیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا، مجھے باتوں کے دوران کبھی کبھی بات بھول جاتی ہے۔۔۔شاید اب آپ وجہ جان جائیں گے۔

میرا سر چکرا گیا، جس کی نشاندہی دماغ کر رہا تھا، دل ہر صورت اس کو ماننے سے انکاری تھا۔ یہ خواب تھا یا پھر کوئی ڈاکومنٹری فلم جو قدرت خود شوٹ کر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرنا چاہیں کہ اسی لمحے خون کے چند قطروں کی رہنمائی میں چلتی جینی نے ایک چیخ کے ساتھ واش روم کا دروازہ کھولا۔

اسٹوڈنٹس اور ہوٹل کے عملے نے دوڑتے ہوئے جینی کی تقلید کی۔ مجھے چیخ کے ساتھ

جینی کے زمین پر گرنے کی آواز آئی تھی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں سب سے آخر میں واش روم کے دروازے کے قریب پہنچا۔ وہاں جو میں نے دیکھا، اس نے ساری زندگی مجھے ڈراما تا رہ ڈر رکھا۔

"کیا تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے پیاروں کو مرتے دیکھا ہے، اس صورت میں جب وہ بے گناہ ہوں؟" بہت دور ماضی کے دریچوں میں سے کسی کی آواز گونجی تھی۔ واش روم کا نیم کھلا دروازہ دیکھنے والوں کو ہولا رہا تھا۔ وہاں زندگی کی حرارت پیدا کرنے والا مائع، یعنی خون کا جما ہوا تالاب تھا۔ میں نے پھٹی آنکھوں سے خون کی وجہ تلاش کی۔

وہاں سیاہ تارکول سا انسانی جسم، کسی سیاہ ململی کپڑے کی طرح ایک کونے میں ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

"صرف اس لیے ان کا گناہ ان کی سچائی اور سیاہ رنگ ہو؟" میرے ذہن میں سالوں پہلے کسی کی آواز گونجی۔

لاش کے بال اور ناخن بے دردی سے نوچے گئے تھے۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ڈراؤنا خواب تھا یا حقیقت۔ پولیس ہارن کی آواز، سیکرٹ پرفیوم اور جمے ہوئے خون کی ملی جلی سی مہک اور کسی کے گذشتہ ہوتے الفاظ سے میں نے اپنا ذہن ڈوبتا ہوا محسوس کیا تھا۔

"میں جانتی ہوں اقلیت ہونا کیسے ہوتا ہے۔ چاہے وہ مذہب کی وجہ سے ہو یا پھر رنگ کی وجہ سے۔" بہت پہلے کسی نے کہا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ سارا منظر ختم ہو گیا تھا۔

اندھیرا، جو پر سکون ہوتا ہے، سیاہی، جو ہر رنگ پر غالب ہوتی ہے، خاموشی، جو فرار ہوتی ہے، میں نے اپنے وجود پر یہی جذبات محسوس کیے۔ اگلے لمحے میں زمین بوس ہوا تھا۔

☆......☆......☆

میں نے آنکھیں کھولیں تو سفید سے کمرے میں خود کو پایا، بڑا سا کمرہ جہاں ہذیان کی حالت میں بے ہوش ہونے والا میں واحد فرد نہیں تھا۔ میں نہ جانے کتنے گھنٹے یوں ہی بے سدھ لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ قریب سیاہ فام نرس اور ڈاکٹر کچھ بول رہے تھے، لیکن میں نہیں سن پایا۔

تو وہ خواب نہیں تھا! میں نے چاہا تھا، وہ خواب ہو جائے۔ ہم خواب اور حقیقت میں اس قدر الجھے ہیں کہ کبھی خوابوں سے فرار کے لیے حقیقت پسندی کا لبادہ اوڑھتے ہیں، اور کبھی حقیقت سے چھپنے کے لئے خوابوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ سہارا کوئی بھی کبھی نہیں بنتا، نہ خواب نہ حقیقت۔ بس ہم گھن چکر بن کر خواب اور حقیقت کے مدار میں گھومتے، خود کو بیوقوف بناتے ہیں۔

تو۔۔۔ تو کیا صوفیہ الیگزینڈر واقعی مر گئی تھی؟ کیا وہ واقعی قتل ہو گئی تھی؟ کون سا احساس مجھے ہولا رہا تھا؟ اس کے مر جانے کا؟ اس کے قتل کا؟ یا پھر اس کے چلے جانے کا؟

میں نے ایک دوست کھویا تھا۔ لیکن کیا یہ صرف کھو دینا ہوتا ہے؟ کیا کسی کو کھو دینے میں قدرت کا کوئی اشارہ نہیں ہوتا؟

اس دن کے بعد میں جب بھی جینی یا اس سمیت، ہماری یونیورسٹی کے ان ایکٹوسٹ طلباء سے ملا، جنہوں نے صوفیہ کی لاش کو دیکھا تھا، مجھے وہ کبھی پہلے جیسے نہیں لگے۔ انہوں نے اپنی شخصیتوں میں سے کچھ کھو دیا تھا۔ کچھ بہت زیادہ گہرا کھو دیا تھا، اور کچھ بہت عجیب خاموشی مستعار لی تھیں۔

میں جانتا تھا، ہم سب سالوں تک شفایاب نہیں ہو سکیں گے۔ صوفیہ الیگزینڈر کو کس نے قتل کیا؟ قاتل قتل کر کے فرار ہو چکا تھا۔ یقیناً اس میں اس کے امریکی کزن کا ہاتھ ضرور ہوگا،

مجھے سو فیصد یقین تھا۔ باقی سب یہ نہیں جانتے تھے کہ ان دونوں کا تعلق کس نوعیت کا تھا، میں جانتا تھا، خصوصاً مارک سے وہ آخری ملاقات، مجھے یقین تھا کہ مارک کے بغیر اس میں کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا۔

یونیورسٹی میں کسی نے مارک کا نام لیا کہ وہ بھی اس سے دو دن پہلے غائب ہو چکا تھا، لیکن زیادہ تر طلباء کا شک تھا کہ وہ کوئی ہراسمنٹ کا کیس تھا، ہوٹل کے عملے پر شک کیا جانے لگا، جبکہ سی سی ٹی وی کیمرے اور ہوٹل کے عملے کے بیان کے مطابق وہاں کچھ بھی مشکوک نہیں تھا، ایک دم ایسی واردات اتنی صفائی سے ہوئی، اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے سیاہ فاموں کے ملک میں ایسے قتل کی گئی تھی۔ وہاں کوئی سفید فام، ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ اکثریت اور اقلیت کا تقاضا تھا۔

خیر، میں آپ کو وہ معلومات نہیں بتاؤں گا جو آپ کو کوئی بھی اخبار آسانی سے دے سکتا ہے، الغرض صوفیہ کا قاتل نہیں مل سکا۔ پولیس نے ہم پر بھی شک کیا، لیکن مجھے یقین تھا کہ جو لوگ بھی اس کیس کی سرپرستی کر رہے تھے، وہ وہی تھے جن کو کسی کا بھی مان رکھنے کے لیے، جیب کی گرمائش چاہیے ہوتی ہے۔

یہ تیسری دنیا کے انسان بکاؤ کا مال کیوں ہوتے ہیں؟

میں نے اپنے بیان میں مارک پر شک کا کہا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ قتل سے دو دن پہلے نیویارک چلا گیا تھا، اس کا اس سے کوئی سروکار ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ وہ تو خود امریکہ میں بیٹھا، صوفیہ کے لیے آواز بلند کر رہا ہے، گوروں پر کسی کو شک بھی نہیں ہوتا، سارے گناہ کالے کرتے ہیں۔

مجھے افسوس رہا کہ میں صوفیہ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔ نہ اس کی فیملی تھی جو اس کے لیے

آواز اٹھاتی، وہ خود مختار تھی، جو دور پار کے کزنز یا انکل تھے، انہوں نے اس کے فیونرل میں آنا گوارہ نہ کیا تو، اور تو کسی سے بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی، سوائے اس کے کہ چند سال بعد وہ کیس خود ہی بند ہو جاتا۔

یونیورسٹی طلباء بہت زیادہ پریشان تھے، انہوں نے ایک اچھا ساتھی کھویا تھا، لیکن زندگی کا اصول ہے، ہم سب کو متبادل مل جاتے ہیں۔ جانے والا اپنی جگہ خالی چھوڑ کر جائے تو وہ بہت جلد پُر ہو جاتی ہے۔ صوفیہ کی بھی ہو گئی۔

یونیورسٹی انتظامیہ نے بہت آواز بلند کی اور اپنی اسٹوڈنٹ کے لیے بڑے پیمانے پر انصاف مانگا، لیکن کیا انصاف مانگنے پر مل جایا کرتا ہے؟

آپ کو لگ رہا ہوگا کہ صوفیہ کے بارے میں سرسری انداز میں کہانی سنا رہا ہوں، تو ٹھیک لگ رہا ہے۔ دراصل صوفیہ میری کہانی کا ثانوی کردار ہی تھی۔ آپ کو پتہ ہے نا؟ مرکزی کرداروں کا۔ میری کہانی کا مرکزی کردار کون ہے؟ وہ میری ماں نہیں تھی، وہ صوفیہ بھی نہیں تھی۔

وہ میں ہوں۔ میری کہانی کا مرکزی کردار میں ہی رہا ہوں۔ ہیرو بھی، ولن بھی۔ مجھے برا بھلا مت کہیں، مجھ سے زیادہ دکھ شاید ہی کسی کو ہوا ہو صوفیہ کی موت کا، کیونکہ وہ میری واحد دوست تھی، لیکن کیا میں اس کی وجہ سے اپنی زندگی کی کہانی کو نظر انداز کر سکتا ہوں؟ کیا آپ میرے لئے اپنی کہانی کو سائیڈ پر رکھ سکتے ہیں؟ نہیں نا؟ کیونکہ میرے نزدیک میرے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ اہم ہے، جیسے آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے وہ مجھ سے زیادہ ضروری ہے۔

ایسا ہی ہوتا ہے۔ چند گھنٹوں بعد مجھے صوفیہ کے ایک گروپ ممبر نے یونیورسٹی کیمپس میں

روکا اور کہا۔

"کیا آپ آج تھوڑی دیر ہاسٹل آ سکتے ہیں؟ ہم سب صوفیہ کے فرینڈز آج کی شام اس کے نام کرنا چاہتے ہیں۔"

مجھے لگا کسی نے میرے زخموں کے کھرنڈ نوچ ڈالے ہوں۔

"کوشش کروں گا۔" میں نے نیم دلی سے ہامی بھری۔

شام کو میں قدموں کو گھسیٹتے وہاں پہنچا۔ آج صوفیہ کی پریزنٹیشن کو دوبارہ سے ڈسکس کیا جا رہا تھا۔ شاید اس کے گروپ ممبرز ہار نہیں مانے تھے۔ انہوں نے سب سے آخر میں وہ ڈاکومنٹری چلائی جس کو میں نے اگلے دن دیکھنے کے لیے ملتوی کیا تھا۔

وہ اگلا دن کبھی نہیں آیا تھا، کیونکہ صوفیہ مر چکی تھی۔ یہ مرنے والے اپنے ساتھ ان تمام کاموں کی اہمیت اور شدت بھی کیوں لے جاتے ہیں؟ سب کچھ بے معنی کیوں ہو جاتا ہے؟

ہم نے وہ ڈاکومنٹری دیکھی اور ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں صوفیہ کے مرنے کے چار مہینے بعد رویا تھا۔ لیکن پھر یہ ایک ایسے منزل کی ابتدا تھی کہ اس کے بعد میری آنکھیں بہت کم خشک ہوئی تھیں۔ جس اسٹوڈنٹ نے ڈاکومنٹری میں کردار ادا کیا تھا، وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔

"کیوں کیا میں نے آخر یہ پلے۔ صوفیہ جانتی تھی کہ ایسا ہوگا، اسی لیے اس نے یہ پلے لکھا، ایسے کیوں مر جاتے ہیں سب۔" وہ سیاہ فام اسٹوڈنٹ بہت زیادہ تکلیف سے رو رہی تھی۔ ہم سب بھی بہت شدت سے روئے تھے۔

ڈاکومنٹری میں ایک ایم۔ آئی۔ ٹی گریجویٹ سیاہ فام مسلمان سائنسدان، جو بین الاقوامی سطح پر وسیع تمغے جیت چکی ہوتی ہے، کی لاش کسی گندے پانی کے تالاب سے دریافت ہوتی

ہے۔اور اس کا قاتل ہمیشہ کے لیے گمنام رہتا ہے۔یہی تو ہوتا ہے ہمارے ہاں کی پچاس فیصد کہانیوں کا انجام۔

☆......☆......☆

میں شکستہ قدموں سے اپنے اپارٹمنٹ واپس لوٹا۔کسی کی آواز میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔

''تمہیں کبھی خدا کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی؟''

کچھ بہت اندر ٹوٹا تھا۔کیا؟ میں نہیں جانتا لیکن کسی چیز کے ٹوٹنے کی چھنک مجھے محسوس ضرور ہوئی تھی۔میں بہت زیادہ ڈیپریشن کا شکار تھا۔اس واقعے نے مجھ پر واضح کیا کہ میں کس قدر کمزور اعصاب کا مالک تھا۔مجھے راتوں کی نیند میں جمے ہوئے خون کا تالاب نظر آتا تھا۔ میرا دل بند ہونے لگتا۔

ایک مایوسی تھی جو ختم نہیں ہوئی تھی۔ایک یاسیت تھا جس کو زوال نہیں تھا۔میں جیسے کسی گرداب میں جکڑا ہوا تھا،جو مجھے اندر ہی اندر دھنستا جا رہا تھا۔سب ختم ہو رہا تھا۔آہستہ آہستہ، لیکن مسلسل۔مجھے امید کی خواہش نہیں تھی۔لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ امید کا نہ ہونا کتنا بڑا ڈیپریشن ہے؟

میرے لیے سب کچھ بے معنی ہو گیا تھا۔وجہ میں نہیں جانتا تھا۔صوفیہ میری دوست تھی، اگر وہ ہوتی تو میرے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مجھے اسی دن کھینچ لے جا کر وجہ پوچھتی،لیکن یہی تو بات تھی،صوفیہ ہی تو نہیں تھی۔

میں انسانیت کا پرچار کرتا تھا،کون سی انسانیت صوفیہ کو بچا سکی؟امریکی ایجنسی میں انسانی حقوق کے محافظ کو جب سیاہ انسانوں سے گھن محسوس ہو،تو کیا میں اب بھی انسانیت کی تقلید کا

روادار تھا؟

میں نے اپنی ماں کی پڑھائی گئی تحقیق سے مذہب کو برا بھلا کہا لیکن انسانی جان کی اتنی ارزانی دیکھ کر مجھے خود پر افسوس ہوا تھا۔۔۔صرف افسوس!

کتنا آسان تھا نا یہ بس انسانوں کا مر کر ختم ہو جانا۔ ''خوابوں کا مجموعہ'' ہونے سے ''کچھ بھی نہیں'' ہو جانا۔ انسانیت کا لبادہ اوڑھے بھی مکروہ چہرے ہوتے ہیں۔ شاید آپ سمجھ رہے ہوں کہ میں فقط مفروضے کی بنا پر مارک کے خلاف بول رہا ہوں۔ نہیں۔ آپ میری جگہ نہیں ہیں، آپ نے مارک کی آنکھوں میں صوفیہ کے لیے نفرت نہیں دیکھی۔ آپ نے سفید آنکھوں میں خوف نہیں دیکھا۔ آپ نے موت نہیں دیکھی، اپنی نہیں، خود سے وابستہ انسانوں کی۔ خود مرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اپنے سامنے اپنے پیاروں کو مرتا دیکھنا بہت تکلیف دہ۔

آپ شاید اسے کتابی بات سمجھیں، لیکن آپ نہیں جانتے، کتابی باتیں بھی انسانی تجربے کے بعد قلمبند کی جاتی ہیں۔

اس رات میں نہ جانے کتنی دیر تک روتا رہا۔ ہاں یہ سچ ہے میں صوفیہ کے مرنے کے چار مہینے بعد رویا تھا۔ صبح کے قریب مجھے اس کی آواز اور باتوں نے صحیح معنوں میں بے بس کر دیا تھا۔ صوفیا لیگز بینڈر ایک دفعہ بولی تھی۔

''والٹیئر نے کہا تھا کہ اگر خدا موجود نہیں ہے، تو خدا کو ایجاد کرنے کی ضرورت ہے، جینے کی امید کے لئے خدا کا ہونا لازم ہے۔''

اب یہ میرا معمول بن گیا تھا، جب میں اکیلا ہوتا تو میرے دماغ کی نسیں پھٹنے کی حد تک درد کرتی تھیں۔ میں چند ہفتوں میں ہذیان کی انتہائی حدود میں مبتلا ہو گیا، وہ سنائی دیتا جو کوئی نہ بولتا تھا، وہ دکھائی دینے لگتا جو کہیں موجود نہیں ہوتا تھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ شاید میں بھی۔

اس روز میں نے خود کو سارا دن تھکا کر نیند کی خواہش کی۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے سفید آنکھوں

نے آ لیا۔

"تمہیں کبھی خدا کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی آرزک؟"

میں بے ساختہ اٹھ بیٹھا۔ اب یہ زیادہ ہو رہا تھا۔

پہلے میں آٹھ گھنٹے کی کلاسز کے بعد کرسی میں بیٹھے بیٹھے سو جایا کرتا تھا، ابھی میں اکیس

گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد بھی لیٹتا تو ماضی کے نقش میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہی سرخ خون کا

تالاب۔ کٹا جسم اور سیکرٹ پرفیوم کی خوشبو۔ پہلے میں اور اب میں بہت زیادہ فرق تھا۔

پھر یونیورسٹی کا رزلٹ بھی آ گیا، مجھے جماکا کی ایک پرائیویٹ میڈیا کمپنی میں بطور صحافی

نوکری مل گئی۔ میں نے معمول کے اوقات سے چھٹی کے وقت پر ایک جنرل اسٹور میں اپنے

لیے منیجر کی نوکری بھی تلاش کر لی۔ اب میں دن میں اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ رات ایک بجے

تھکن سے چور بستر پر لیٹتے ہی ساری تھکن غائب ہو جاتی، اس تھکن کی جگہ بے چینی اور

ڈپریشن نے آ لی تھی۔

اس دن بھی ایسا ہوا تو میں نے کسی ماہر نفسیات کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ میں شہر کے

ایک قابل اعتبار ماہر نفسیات کے پاس گیا۔ جارج ایک جوان لیکن بے حد بردبار ماہر نفسیات

تھا۔ اس نے پہلے دو سیشن میں صرف مجھے سنا، مجھے یقین ہے وہ بھی صوفیہ کی موت کے واقعے

پر کچھ افسردہ ہوا ہو گا کیونکہ وہ خود بھی ایک سیاہ فام تھا، لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا تھا۔

تیسرے سیشن میں، میں نے اسے مذہب والی باتیں بتائیں تو اس نے مجھے بہت مخلصانہ

مشورہ دیا۔

"تم واقعی خدا کی تلاش کیوں شروع نہیں کر دیتے؟"

مجھے حیرت ہوئی، میں اس کے پاس ایسے مشورے کے لئے نہیں آیا تھا۔

"مگر کیوں؟" میں نے کسی قدر برہمی سے پوچھا۔

"تمہیں اگر صوفیہ کی بہت ساری باتوں میں سے مذہب والی باتیں ابھی یاد آ رہی ہیں، تو تم فرار کی بجائے خدا کو ڈھونڈو۔ زخموں کو مندمل ہونے کے لئے سینا پڑتا ہے، نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ تم اس سانحے کو ایک دم بھلانا چاہتے ہو، اور ایسا کرنے کے لیے تم اسے دانستہ نظر انداز کر رہے ہو۔ ٹراما اور فوبیا ایسے کبھی شفایاب نہیں ہوتے۔ ڈر کا سامنا کیا جاتا ہے۔" اس نے کچھ تفصیل سے کہا۔ میں مطمئن نہیں ہوا تھا۔

وہ مجھے ہر سیشن کے بعد کوئی اسائنمنٹ دیتا تھا۔ کوئی ایکٹویٹی۔ اس دفعہ اس نے مجھے یہ کام دیا کہ میں خدا کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہوں؟ مجھے چند الفاظ میں خدا کے بارے میں اپنی رائے کو قلمبند کرنے کا کہا گیا تھا۔ شاید وہ مجھے صوفیہ سے جڑی چیزوں کے خوف سے آزاد کرانا چاہتا تھا اور ان دونوں خدا کا بڑا ذکر، بہر حال مجھے صوفیہ کے قتل والے منظر میں لے جاتا تھا۔

مجھے ایک ہفتے بعد دوبارہ آنا تھا، اس رات میں نے خدا کے بارے میں کاغذ پر کچھ لکھنا چاہا۔ مجھے حیرت ہوئی مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ خدا کیا ہوتا ہے۔ کبھی اس کو جاننے کی دلچسپی ہی پیدا نہیں ہوئی۔ کبھی ایسے حالات ہی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ مجھے امان کے لیے خدا کی پناہ کی ضرورت رہی ہو۔

میں نے بہت سوچا، ہر اس گفتگو کو ذہن میں لانے کی کوشش کی جب مجھے کسی نے خدا کے بارے میں کچھ بتایا ہو۔ ایک دم میرا سانس بند ہونے لگا، ٹھنڈے پسینے سے میری پیشانی تر ہو گئی تھی۔ ایک احساس اجاگر ہوا کہ جس انسانیت کی خاطر میں نے خدا سے کنارہ کشی اختیار کی

تھی، مجھے پناہ تو وہاں بھی نہیں ملی۔ انسانیت تو ساری خود ہی دکھی ہے۔ تکلیف میں ہے۔ دکھی انسانیت کب کسی کو پناہ دے سکتی ہے۔

مجھے پہلی دفعہ ایک خیال آیا، یہ جو روز لوگ کتنے مرتے ہیں، ان کے پیچھے رہ جانے والے اپنے درد کا علاج لینے کہاں جاتے ہیں؟ ماہر نفسیات کے پاس؟ کیا ان کے پاس اتنے وسائل ہوتے ہیں کہ وہ ماہر نفسیات کا سہارا لے سکیں؟ امید خرید سکیں؟ نہیں۔ بالکل نہیں۔ تو یہ انسانیت اتنی سفاکیت کے باوجود کیوں قائم ہے؟ انسان مایوسی سے کیوں نہیں مرتے؟

میرا سر پھٹنے لگا تھا۔ میں کاغذ پر سر رکھے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

☆......☆......☆

ایک ہفتے بعد میں جارج کے سامنے پھر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک کاغذ پڑا تھا، جسے وہ پچھلے چند لمحوں سے دیکھ رہا تھا۔

”خدا شاید قدرت کو کہتے ہیں، وہی قدرت، جس نے صوفیہ کو بے دردی سے قتل کیا۔“

میں نے بس یہ ایک سطر خدا کے بارے میں لکھی تھی۔ میں خدا کو اتنا ہی جانتا تھا۔

”خدا قدرت ہی ہے۔ بہت زبردست۔ تم خدا کے بہت قریب ہو۔“ جارج نے مجھے یوں شاباشی دی تھی گویا وہ خدا کے دربار کے باہر پہرا دینے والا ہے، جسے معلوم ہے خدا کے نزدیک کون زیادہ اہم ہے۔

”میں مذہب کو نہیں مانتا۔“ میں نے کسی قدر ٹوٹے یقین سے کہا تھا۔ جارج نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مذہب تمہارا اور میرا ذاتی معاملہ ہے، میں تم سے مذہب کا ذکر نہیں کروں گا۔ خدا کا تعلق کسی مذہب سے تو ہرگز نہیں ہے۔ خدا کا مذہب نہیں ہوتا۔ انسانوں کا ہوتا ہے۔ ہم فی الوقت

صرف خدا کی تلاش کر رہے ہیں۔"

تب میں نہیں سمجھا تھا اس کی اس بات سے کیا مراد تھی۔ بہت عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا، وہ مجھے خدا کو ڈھونڈنے کا نہیں کہہ رہا تھا، نہ ہی اس کو اس میں دلچسپی تھی کہ میں کس عقیدے سے خدا کو مانتا ہوں، وہ مجھے کوئی امید پکڑانا چاہتا تھا۔ وہی خدا، جو مایوسی اور برے وقت میں یاد آتا ہے۔ میرے نزدیک بھی خدا صرف وہی ذات رہ گئی تھی جو دکھی انسانیت کا مداوا کرتا ہے، جس کے پاس لوگ علاج کے لیے جاتے ہیں۔ شاک کی کیفیت سے نکلنے کے لیے جو سہارا خدا دیتا ہے، وہ انسان کا نہیں ہوتا کیونکہ خدا کو خود بھی کوئی دکھ نہیں ہوتا۔

خدا، خدا ہوتا ہے۔ وہ کبھی دکھی نہیں ہوتا، وہ کبھی خون کے سرخ تالاب اور سیکرٹ پرفیوم کی مہک سے پریشان نہیں ہوتا۔

خدا کبھی آئزک جیسا نہیں ہوتا۔ یہ بات مجھے اپنی چھ مہینے کی تھیراپی میں معلوم ہوئی تھی۔ میں نے صوفیہ کی موت کے دو سال تک خدا کو ڈھونڈا تھا، امید تلاش کی تھی۔ مجھے امید مل بھی گئی تھی۔ لیکن میرا خوف ختم نہیں ہوا تھا۔

مجھے یہ امید مل گئی تھی کہ انسان اگر زخمی ہو، تو اس کا مداوا کرنے انسان نہیں آتے۔ صوفیہ الیگزینڈر کی موت کا مداوا کوئی انسان نہیں کر سکتا تھا۔ کسی انسان کی موت کا مداوا کوئی انسان نہیں کر سکتا۔ انسان آپ کو کندھا دے سکتا ہے، آپ کے ساتھ بیٹھ کر چند گھڑی رو سکتا ہے، لیکن آپ کی تکلیف کے سامنے وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ آپ کو امید کا ایک کونا ملے۔ کوئی ایسی رسی، جو یہ یقین دلائے کہ وہ اندھیرے میں روشنی کا ہالہ بنے۔

خدا کی ذات میرے لیے ان دنوں ایسی ہی کوئی روشنی بن گئی تھی۔ اسفل السافلین، (بدترین انسانوں) کے اندھیرے میں دودھیا اجالا!

ان چھ مہینوں کے بعد میں کسی حد تک بہتر ہو گیا تھا۔ خوف ختم نہیں ہوئے تھے، لیکن ہذیان کی کیفیات کچھ کم ہو گئی تھیں۔ جارج نے بہت کوشش کی تھی کہ میں فوبیا سے نکل آؤں، لیکن ایسے خوف سے کیسے نکلا جا سکتا ہے جس کا انسان کو معلوم ہی نہ ہو کہ اسے کس چیز کا خوف ہے؟ صوفیہ کے مرنے کا؟ جمے ہوئے خون کا؟

خوف اور بے چینی، تھیراپی سے بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے جارج سے ملنا کم کر دیا، کیونکہ میں جانتا تھا وہ بھی انسان ہے، چاہے وہ کتنی بھی کوشش کر لے وہ خدا نہیں بن سکتا۔ امید بچ سکتا ہے، لیکن خدا کا نام لگا کر۔ امید اس کے پاس خدا کی صورت میں موجود تھی، اور میرے لیے جارج کے پاس مزید شفا نہیں تھی۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب جارج سے ایک لمبے عرصے کے بعد کی ملاقات سے میں واپس آ رہا تھا۔ جارج نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ہجرت کر لوں۔

"تمہارے لیے بہتر ہو گا کہ کچھ عرصے کے لیے یہاں سے کسی دوسرے شہر یا ملک چلے جاؤ، کچھ عرصے کی ہجرت انسان کو پرسکون کر دیتی ہے۔"

"تم فرار کو ہجرت کا نام دے رہے ہو جارج۔ مجھے سکون کی تلاش ہے جو مجھے جغرافیائی اعتبار سے بے نیاز کر دے۔ یہ پرمعنی حل تو نہیں ہے۔" میں نے بہت خشک آواز میں کہا تھا۔ جارج نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن میں کچھ دیر بعد وہاں سے واپس اٹھ آیا۔ جارج ایک اچھا ماہر نفسیات تھا لیکن کچھ پیچیدگیاں نفسیات کی نہیں ہوتی ہیں۔ وہ بے حد حقیقی ہوتی ہیں۔ میرے لیے سکون کی تلاش بھی ایسی پیچیدگی ہی تھی۔

میں اس کے پاس سے واپس آ رہا تھا تو شام کا دھندلکا پھیلنے کے قریب تھا۔ جا بجا لگے فوڈ اسٹالز اور شاپنگ مالز کی روشنیاں جگمگ کرتی بھلی لگ رہی تھیں، میں یوں ہی سست روی سے

آہستہ آہستہ چاروں طرف دیکھتا روڈ سے ہٹ کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ ایک فوڈ اسٹال کے قریب رک کر میں نے آسمان کو دیکھا۔ ہلکی سی ہوا چل رہی تھی۔ جمائکا کا موسم کچھ حد تک گرم ہے، اس دن ہلکی سی خنک ہوا سے زیادہ تر شہریوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ ایسا موسم جمائکا میں بہت خوشی سے منایا جاتا ہے۔ فوڈ اسٹالز کے قریب بینچ پر گاہکوں کا رش ہوتا ہے، کسی کونے میں گٹارسٹ موسیقی کی دھنیں چھیڑتا ہے اور ہنسی خوشی میں غم اڑائے جاتے ہیں۔

کیا میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ میں ان دنوں ہر وہ کام کرتا تھا جو میری نظر میں دوسروں کو پرسکون کر دیتے ہیں، تو مجھے کیوں نہیں؟ مجھے بھی تو سکون چاہیے تھا۔ میں ایک بینچ پر بیٹھا، خوش باش سیاہ چہروں کی مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔ دیکھ کیا، گھور رہا تھا۔ اچانک ایک مانوس سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

وہ آواز تھی یا جادوئی چھڑی سے نکلنے والے سحر کی دھن، میں جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ دور ایک بینچ پر بیٹھا لمبی سی ہیٹ پہنے ایک سیاہ فام گٹارسٹ آنکھیں بند کیے لہک لہک کر گا رہا تھا۔

"اسمیلز آف مٹو سپرٹ!"

وہ انگریزی گانے کے بول تھے جو مجھے چند لمحوں میں سالوں کی مسافت طے کرا کے ماضی میں اپنی اور صوفیہ سے پہلی ملاقات تک لے گئے۔ چند لمحوں میں، میں صوفیہ کے سامنے یونیورسٹی کیفے میں بیٹھا تھا۔

وہ خنک ہوا والی شام پھر خون آلود ہو گئی تھی۔ بہت زور سے کسی کے سینے میں لوہے کی سلاخ پیوست ہوئی تھی۔ سب کچھ صوفیہ سے وابستہ ہو گیا تھا۔ میں ایک دم وہاں سے بھاگا۔ مجھے یقین ہے اسٹال کے بیرے نے ایک دفعہ مجھے تعجب سے مڑ کر ضرور دیکھا ہوگا۔ مجھ جیسے پاگل وہاں بار بار نہیں آتے ہوں گے۔

میں بھاگتے ہوئے اس آواز کی پہنچ سے دور ہونا چاہتا تھا۔ جب مجھے یقین ہوا کہ اب مجھے ماضی کی آوازیں سحر زدہ نہیں کریں گی تو میں نے قدم روکے۔ وہ ایک ویران سا شاپنگ مال تھا، جس کی دائیں طرف نیم تاریکی میں چند بینچ تھے۔ میں ستانے کے لیے وہاں ایک بینچ پر بیٹھا کہ کسی کی سسکیوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

وہ ہلکے سبز رنگ کے حجاب میں لپٹی ایک لڑکی تھی۔ یقیناً مسلمان لڑکی۔ جمائکا میں مسلمان خال خال ہی نظر آتے تھے۔ مسلمان سے میری مراد وہ جو دکھنے میں مسلمان ہوں۔ جیسے اس لڑکی کا حلیہ۔ وہاں اسلام اقلیت میں شمار ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کی موجودگی کے باوجود وہاں ظاہری طور پر مسلمانوں کا یوں اظہار بہت کم ہے۔ بہت کم مسلمان خواتین حجاب پہنتی ہیں، اور بہت کم مرد حلیے سے پریکٹسنگ مسلمان ہیں۔ اس لیے مجھے حجاب میں لپٹی اس لڑکی نے حیران کیا تھا۔

شاید وہ بھی ایک سفید فام کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر کچھ متذبذب ہوئی تھی اسی لیے جلدی جلدی آنسو صاف کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا سب ٹھیک ہے؟" میں نے انسانیت کے جذبے سے پوچھا۔ مجھے روتے ہوئے لوگ تکلیف دیتے تھے۔ وہ ایک دم گھبرا گئی اور اثبات میں سر ہلا کر جانے لگی کہ اس کا فون بجنے لگا۔ فون اٹھا کر وہ میرے سامنے کھڑے کھڑے ہی جذباتی انداز میں فون پر بولنے لگی۔

"کیسی طبیعت ہے اب عثمان کی؟"

"نہیں وہ اپائنمنٹ کینسل کر دی انہوں نے۔"

"اچھا، میں چند اور جگہوں پر ڈھونڈتی ہوں آپ فکر نہ کریں۔"

نہ جانے وہ اور کیا کہہ رہی تھی کیونکہ میری جانب دیکھ کر اس نے آواز دھیمی کی۔ اس نے

فون بند کیا تو میں نے دوبارہ پوچھا۔

"کیا سب ٹھیک ہے؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں۔"

اسے یقیناً ایک اجنبی کا اتنا استفسار حیران کن لگا تھا لیکن نہ جانے وہ کب سے اکیلے ضبط کر رہی تھی، اس لیے خاموشی سے دائیں بینچ پر بیٹھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔

"میرے چھوٹے بھائی کو بلڈ کینسر ہے، اور مجھے مینجر نے جاب سے نکال دیا ہے، کسی نئی جگہ اپلائی کروں تو حلیے کی وجہ سے کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتے ہیں۔ پہلے میں ایک مال میں سپروائزر تھی، اب سیلز گرل کی جاب بھی نہیں ملتی۔"

"لیکن تمہارے حلیے سے کسی کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ یہ تو تمہارا بنیادی حق ہے۔"

لڑکی نے سر اٹھا کر بہت تعجب سے مجھے دیکھا۔

"تم خبریں نہیں دیکھتے کیا؟"

مجھے اس کے سوال پر حیرت ہوئی۔ میں تو خود ایک صحافی تھا، میری تو نوکری ہی خبروں سے چلتی تھی۔

"دیکھتا ہوں، لیکن کیوں؟"

"دنیا بھر میں جہاں اسلام اقلیت میں ہیں، وہاں مسلمان ٹارچر کا شکار ہیں، حکومت کو مسلمان باعث نفرت لگتے ہیں، اور یہ نفرت اور خوف اب عوام میں بھی پایا جاتا ہے۔ میرا بھائی روز خون کے لیے ترستا ہے، میں اس کے لئے زندگی کے چند سال نہیں کما سکتی، انسانوں کو کیا نقصان پہنچاؤں گی۔"

وہ اب رو رہی تھی۔

"ہاں لیکن وہ تو ہیلو جرنلزم کی وجہ سے بدنام کیا جا رہا ہے تمہارے مذہب کو اور ہم سب یہ

جانتے۔۔۔" ایک دم جیسے میری زبان سے الفاظ کھینچ لیے گئے تھے۔

ہیلو جرنلزم، اقلیت، مذہبی عقائد کی وجہ سے نفرت، تعصب، رنگ و نسل کا فرق۔ کیا کیا تھا جو ایک دم میرے ذہن میں جاگا تھا۔ خون کا تالاب، خون کی ملگجی سی مہک، کٹی ہوئی انگلیاں، مارک کی آنکھیں، جینی کی چیخ، سیکرٹ پرفیوم کی شیشی کے ٹکڑے۔ ایک دم میرا سانس بند ہونے لگا۔

"اور تمہیں پتہ ہے جرنلزم میں جس مذہب کو سب سے زیادہ ٹارچر کیا گیا ہے وہ کون سا ہے؟" ایک شام کسی نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"جس مذہب کو عفریت بنا کر دکھایا گیا ہے، وہ اسلام ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ اس سے خطرہ محسوس کیا جاتا ہے۔"

کسی کی سفید آنکھوں میں سچائی تھی۔

"سیاہ فاموں کو بھی یوں ہی ٹارچر کیا گیا، عوام خبروں کی گہرائی میں نہیں جاتی، انہیں سرسری خبریں چاہیے ہوتی ہیں۔ شہ سرخی میں چھپی گئی چند باتیں، جہاں آپ کو کسی سے نفرت کرنے کے لیے وجہ مل جائے، اور امریکیوں نے بہت خوبصورتی سے دو وجوہات تراش لی ہیں۔ مذہب اور رنگ۔"

میں ادھر کھڑا جیسے پتھر کا بت بن گیا تھا، وہ لڑکی ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی، اسے بھی شاید اندازہ ہوا میں ٹھیک نہیں ہوں۔

"آر یو اوکے، کیا تم ٹھیک ہو؟" اس نے چند چٹکیاں بجا کر مجھے متوجہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ میں حواس باختہ سا ہوا تھا پھر اسی بینچ پر جا کر بیٹھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھی تھی۔

"کیا تم خدا کو جانتی ہو؟" میں نے ایک بے حد بچکانہ سوال پوچھا۔

"وہ تو ہے ہی ہمارا۔" وہ بے ساختگی سے بولی۔ اتنا یقین؟؟ اتنا اعتبار؟ وہ بھی ایک انجان خدا پر؟ میں نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا تمہیں خدا پر یقین ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یہ یقین ہی تو ہے جو مجھے مشکلات میں بھی تھامے رکھے ہوئے ہے۔ اگر مجھے اس پر یقین نہ ہوتا تو میں ابھی اپنا لباس تبدیل کر کے اپنی پہلی نوکری پر واپس چلی جاتی۔" وہ بینچ کے آخری سرے پر ٹک کر بولی تھی۔

"یہ یقین کیا ہوتا ہے؟" اس کی کہانی سننے میں اپنا دکھ لے کر بیٹھ گیا۔

"یقین اندھے کنوئیں میں امید کی کرن کو کہتے ہیں۔ جب سب ختم ہو جائے، کوئی سہارا دینے والا باقی نہ رہے، آپ کے چاہنے والے آپ کے خلاف ہو جائیں اور آپ کا سانس بند ہونے لگے، پھر بھی آپ کو خدا کی طرف سے روشنی کی امید ہو تو اسے یقین کہتے ہیں۔"

وہ لڑکی ابھی اپنے آنسو پونچھ چکی تھی۔

"کیا یقین سے سکون مل سکتا ہے؟" میں نے بہت فضول بات پوچھی، لیکن بات میرے مطلب ہی کی تھی، اس لئے اس وقت بے تکی نہیں لگی۔

"ہاں۔ خدا اگر امید دیتا ہے تو سکون کیوں نہیں۔" وہ اب مجھے امید دلا رہی تھی۔

"میں بہت عرصے سے سکون کی نیند نہیں سویا، کیا تم اپنے خدا سے دعا کرو گی کہ مجھے امید اور سکون ملے؟" میں بس اتنا ہی طاقتور انسان تھا کہ مذہب کے خلاف اگلتے اگلتے مذہب میں پناہ ڈھونڈ کر دعا پر آ پہنچا تھا۔ سزا جزا کا مالک یقیناً اپنے مغرور نافرمان بندے کا یوں گر کر مانگنا دیکھ رہا ہوگا۔

"میں کیوں، تم خود کیوں نہیں؟ یہ تو ایسا ہے کہ بیمار تم ہو اور ڈاکٹر کے پاس مجھے بھیج رہے

ہو، اٹھو چلو، میں تمہیں ایسی جگہ لے کر جاتی ہوں جہاں آج کی رات تمہیں بہت پرسکون نیند آئے گی۔ میرے ساتھ چلو۔" رات کا ابتدائی پہر تھا، مجھے لگا، میں پہلی دفعہ اتنا دیوانہ ہوا تھا۔ ایک راہگیر سے اتنی بے تکلفی؟ وہ بھی میں یعنی آرزک، کیسے رکھ سکتا ہوں؟ لیکن وہ اب اجنبی راہگیر نہیں رہی تھی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا جارہا تھا کہ وہ ایک وسیع بلڈنگ کے سامنے آکر رکی۔ سفید اور فیروزی رنگ کی وہ بہت اونچی سی بلڈنگ تھی جس کے دو الگ الگ داخلی راستے تھے۔ ایک شاید خواتین کے لیے، اور ایک مردوں کے لیے۔ اس حجاب میں لپٹی لڑکی نے مجھے ایک طرف اشارہ کرکے بتایا کہ میں وہاں جاؤں، نماز میں نہیں پڑھ سکتا، لیکن اس نے مجھے دعوے کے ساتھ بتایا کہ آج کی نیند تمہاری پرسکون ہوگی، اتنی پرسکون کہ میں نے بچپن میں پنگھوڑے میں بھی نہیں لی ہوگی ایسی نیند۔

پھر وہ خواتین والی طرف چلی گئی اور میں بھی اندر داخل ہوا۔ مجھے لگا میں آسمان پر داخل ہوگیا ہوں۔ وہ کنگسٹن کی سینٹرل مسجد تھی۔ جمائکا کی بڑی مسجدوں میں سے ایک۔ میں سب کچھ فراموش کرکے بچوں اور نوجوانوں کو دیکھنے لگا، کچھ لوگ ستا رہے تھے، کچھ بیٹھے نماز پڑھ رہے تھے اور کچھ کے ہاتھوں میں دانوں اور موتیوں کی لڑیاں تھیں جسے وہ گھما رہے تھے۔ کچھ نوجوان نماز میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ میں نے انھیں بہت حسرت سے دیکھا، ان کے پاس وہ خدا تھا جس کے سامنے وہ رو کر دل ہلکا کرلیتے تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں، یہی لوگ نماز کے بعد جب واپس جاتے ہوں گے تو بے حد خوش باش ہوں گے۔ خدا انھیں یقین اور امید عطا کرتا ہوگا۔

پھر ایک آواز آئی اور سب لوگ تیزی اور پھرتی سے آگے مائیک کی طرف بڑھ گئے، شاید

وہ امام کی بات سننے لگے تھے، یا شاید وہ نماز پڑھنے لگے تھے۔ میں نے بہت زیادہ خوبصورت آواز میں کسی انجان زبان میں نماز کی مناجات پڑھنے والوں کو دیکھا۔ ایک دم جیسے ہر طرف خاموشی چھا گئی، سینے میں دہکتے آگ کے جلتے الاؤ پر کسی نے ٹھنڈے پانی کی پھوار چھڑک دی تھی۔

میں سب سے آخر میں مسجد کی پچھلی دیوار سے پشت لگائے اپنے سامنے نماز ادا کرتے لوگوں کی پشت کو گھور رہا تھا۔ میں وہاں تھا لیکن میں وہاں نہیں تھا، بے ڈھنگے انداز میں نیم دراز لیٹے، نماز کے الفاظ سنتے سنتے جیسے میرا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا، کوئی چادر تھی جو میرے ذہن پر اوڑھا دی گئی تھی۔

سارا منظر دھندلا ہونے لگا، جو آخری بات مجھے یاد آئی وہ یہ کہ میں نے اس حجابی لڑکی کا نام نہیں پوچھا تھا، میں اس کا شکریہ کیسے ادا کروں گا؟؟ اس کے بعد سارا منظر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کسی نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے اٹھایا۔ میں تعین نہیں کر سکا میں کہاں موجود ہوں۔ وہ ایک اجنبی سیاہ فام چہرہ تھا جس نے مجھے جگایا تھا، مسجد کی کھڑکیوں کے باہر ابھی گھپ اندھیرا تھا۔

"اٹھ جاؤ بچے۔" اس نے مجھے دوبارہ جھنجھوڑا، میں آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

"ابھی کچھ دیر بعد میں فجر کی اذان دوں گا میں، پھر آج امام صاحب بدلیں گے، میں چلا جاؤں گا۔ زنان خانے سے کسی نے پیغام بھجوایا تھا کل رات کہ تمہارا دھیان رکھوں، جا کر منہ ہاتھ دھولو، کچھ کھالو، پھر دوبارہ سو جانا۔" مجھے جاگتے دیکھ کر اس نے آہستہ سے سرگوشی میں مجھے

بتایا۔ شاید وہ جانتا تھا میں غیر مسلم ہوں۔

میں جتنی دیر میں منہ دھو کر آیا، وہ امام سر پر عمامہ باندھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پیچھے اشارہ کیا، وہاں کچھ کھجوریں، پانی، اور سالٹ فش کا سالن رکھا تھا۔ جمائکا میں یہ بہت مشہور مچھلی کی ڈش ہے۔ میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا تو وہ اذان دینے لگا۔ میں دم بخود سا اس سیاہ فام کی آواز کو اپنی رگوں میں اترتا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے سانس حلق میں اٹک گیا ہو۔ میں نے پہلی دفعہ اذان سنی تھی، اور اس سے زیادہ خوبصورت مجھے کوئی آواز نہیں لگی تھی۔ مجھے ان لمحوں میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ سب کچھ۔ صوفیہ کا جمے ہوئے خون کے تالاب میں لتھڑا ہوا جسم بھی۔

اذان کے بعد امام میرے قریب آیا۔

"تم کھا کیوں نہیں رہے، کیا تمہیں پسند نہیں؟" وہ امام متفکر سا بولا۔

مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی دیر سے اسے بہت عجیب طریقے سے گھور رہا تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" وہ بزرگ تھا اور اس کی داڑھی میں سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ جیسے وہ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان کی عمر میں ہو۔

"ردجال حسینی۔" وہ بولا۔

"بہت خوبصورت پڑھتے ہیں آپ۔" میں نے خلوص سے کہا۔ اس کی آواز میں اتنا سکون تھا کہ سننے والے کو نیند آ جاتی تھی۔ وہ اپنی تعریف پر ذرا شرمایا تھا۔

"اتنا بھی نہیں، یہ تو خدا کا کرم ہے کہ سننے والے کو خوبصورت لگی۔ مجھ سے زیادہ خوبصورت آواز تو بلال حبشی کی تھی۔" قاری ردجال نے بہت کسر نفسی سے کہا۔

پھر یہ خدا کا ذکر مجھے نہ جانے کہاں لے کر جانے لگا تو میں نے ایک دم پوچھا۔

"کون بلال؟ آپ کا کوئی دوست تھا؟" وہ بے تکلفی سے بول رہا تھا تو مجھے بھی باتوں

میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

"نہیں نہیں۔" وہ ہنسا۔"بلال حبشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں سیاہ فام حبشی تھے۔جن کی آواز میں اذان نہیں ہوتی تو صبح نہیں ہوتی تھی۔میں تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

وہ تفصیل سے بتانے لگا۔اس نے غیر محسوس انداز میں کھانا میری طرف کیا اور خود بھی ساتھ کھانے لگا،میں بھی معمول کی طرح اس کے ساتھ ہی کھانے لگا۔

"ایک بات بتائیں امام صاحب!یہ انسانیت مذہب پر مقدم کیوں نہیں ہے؟سب کو حیرت کیوں ہوتی ہے۔آپ کے دین میں بھی واضح تفریق ہے،بہت سے معاملات میں۔یہ دین میں بلال حبشی کے واقعے کے باوجود دنیا بھر میں سیاہ فام کیوں گھسیٹے جاتے ہیں؟" نہ جانے کس چیز کا اثر تھا کہ میں اس اجنبی سے یہ سوال پوچھ بیٹھا۔

"دنیا بھر میں نہیں،صرف ان ممالک میں جو تعصب اور شر کو پس پردہ پھیلا رہے ہیں۔ہمارے دین کی آپ کو کوئی ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی جہاں سیاہ فاموں کو نشستوں سے اٹھایا گیا ہو۔میں اس مسجد کا امام ہوں،کالا ہوں لیکن میرے ہم مذہب سفید فام میری تعظیم کرتے ہیں۔میں معاشی لحاظ میں بہت سوں سے بہتر ہوں،لیکن کون جانتا ہے،مجھ سے کمزور طبقے میں مجھ سے بہت بہتر انسان پائے جاتے ہوں۔ہمارے ہاں رنگ اور نسل کی بنیاد پر انسانیت کے پیمانے نہیں رکھے جاتے۔" لقمہ توڑتے اس نے بہت سادگی سے بڑی بڑی باتیں کہہ دی تھیں۔

"جہاں تک انسانیت کی بات ہے،اسلام ایک بہت بڑے پیرائے کو کور کرتا ہے،آپ مطالعہ کریں گے تو آپ کو واضح ہوگا،انسانیت صرف ایک برانچ ہے۔انسانیت انسانوں کی

بھلائی کو کہتے ہیں، اسلام اس کے ساتھ بہت سی اور چیزوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ جو مذہب مسافر اور بھوکے کو کھانا کھلانا عبادت میں شمار کرتا ہے، کیا وہ انسانیت سے انکار کر سکتا ہے؟"

اس نے بات ختم کی اور پانی کا گھونٹ بھرا۔ میں چند لمحے خاموشی سے کھانا کھاتا رہا، شاید بھوک لگی تھی یا پھر شاید وہاں بیٹھے بیٹھے مجھے اپنی ضروریات زندگی کا احساس ہونے لگا تھا جن میں سے کھانا بھی تھا۔ پچھلے کچھ سالوں سے مجھے اپنی یہ حس مفلوج ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"لیکن پھر اتنا خوف کیوں اس مذہب سے؟ کہ حکومتی سطح پر ہی نہیں، انفرادی سطح پر بھی اس مذہب کے لوگوں کو خطرناک گردانا جاتا ہے؟ ان کو نوکری نہیں ملتی، اتنی نفرت کیوں؟ اور کیا اگر اسلام اتنا امن پسند مذہب ہے تو دنیا بھر میں اس کو دہشت گردی کی جڑ کیوں گردانا جاتا ہے؟" میں نے بے خوفی سے پوچھا۔ شاید سوال کرنے کا اختیار مجھے اس نے خود دیا تھا۔

"تم انسانیت کے بارے میں جانتے ہو گے۔ اس کا جواب تو تمہارے پاس ہونا چاہیے، کیوں کمزور ہمیشہ تخریب کا شکار ہوتے ہیں؟ سیاہ فاموں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ دنیا بھر میں ساٹھ فیصد سیاہ فام غیر مسلم ہیں، ان کو نفرت کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے؟ اگر ان بے گناہ سیاہ فاموں کو مارنا آسان ہے جو مسلمان نہیں ہیں تو مسلمانوں کو مارنا کون سا مشکل ہوگا جبکہ ان کے پاس وجہ بھی موجود ہے۔ نائن الیون، مسلمانوں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا ہے۔ غلطیاں مسلمانوں نے بھی بہت کی ہیں، لیکن ایک بات یاد رکھنا، مسلمانوں میں خامی ہو سکتی ہے، اسلام میں نہیں۔ ایک وقت تھا جب مسلمان دنیا بھر میں عروج پر تھے، ان کی سلطنت ہر مذہب اور ہر عقیدے کے لوگوں پر تھی، جیسے ابھی امریکی حکومت ہے۔ عربی زبان بہت ضروری ہوا کرتی تھی، لیکن ابھی حالات پلٹ چکے ہیں، دنیا بھر میں تمام اسلامی حکومتیں خلافت موومنٹ، مغل سلطنت سب بکھر ریزہ ریزہ ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کی کمزوری نے ان

سے اقتدار لے کر مغرب کو پکڑا دیا ہے۔ اب جب نفرت نسلوں میں منتقل ہو جائے تو ہم کیوں ان سے اچھائی کی امید رکھیں۔ غلطیاں ہم میں ہیں اسلام میں نہیں۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہوا، مسجد میں نمازیوں کی آمدورفت بڑھ رہی تھی۔

"میں نماز پڑھا کرآتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میں نیم وا آنکھوں سے ان سب کو دیکھتا رہا۔ وہ بہت زیادہ لوگ تھے، یوں کہ ان میں امام کہیں چھپ گیا تھا۔ جو سامنے تھے وہ صرف قطاریں تھیں، ہر قسم کے لوگوں کی۔

یہ جمائکا کی جامع مسجد تھی، یہاں ہمیشہ لوگ موجود رہتے تھے۔ امام نماز پڑھ کر دوبارہ میرے پاس آیا۔

"میں ابھی چلا جاؤں گا، پھر ایک ہفتے بعد میری باری ہوگی یہاں نماز پڑھانے کی۔ میرا نمبر یہ ہے، رکھ لو۔ کبھی کسی بھی قسم کی ضرورت ہو تو مجھ سے مدد لیتے ہوئے نہ جھجکنا۔" اس نے مجھے ایک کاغذ پکڑا دیا۔ میں یوں ہی ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا۔

"کیا یہ سب مسلمان تھے؟" یہ جانتے ہوئے کہ مسجد میں نماز صرف مسلمان پڑھتے ہیں نہ جانے کیوں میں نے امام سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

"یہ سب مومن ہیں۔ مسلمان وہ ہیں جو کلمہ گو ہیں لیکن نماز پڑھنے نہیں آئے، بلکہ اس وقت سوئے ہوئے ہیں۔" پھر وہ میرے پاس آبیٹھا۔

"تمہیں پتہ ہے جوان آدمی، ان میں سے ہر دوسرا بندہ وہ ہے جو پیدائشی مسلمان نہیں تھا۔ ان میں سے نصف وہ ہیں جو اپنی مرضی سے اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ باقی چائنیز۔"

میری حیرانگی کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں زیادہ تر مسلمانوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہوتا ہے۔ جو اسلامی ریاستیں اسلام کے نام پر آباد ہوئی ہیں، ان میں سے بہت کم کو اپنے مذہب کی قدر ہے۔ جس کے پاس جو کم ہوتا ہے، وہ بیش بہا ہوتا ہے۔ اور کیا تمہیں معلوم ہے بچے؟ یہ سب کس لیے مسلمان ہوئے؟"

وہ میرے سامنے دوزانو بیٹھا صفوں میں موجود "مومنوں" کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں موجود نمازی سب اپنے ورد میں تھے۔ جو منظر میں نے کل رات دیکھا تھا، صبح کا منظر اس سے زیادہ دردناک تھا۔ رونے والے زیادہ تھے۔ خاموشی سے، چپکے چپکے سرگوشی کرتے ہوئے، کوئی سجدے میں تھا، کوئی رکوع میں، تو کوئی دعا میں۔ وہ سیاہ بھی تھے، سفید بھی، ایشیائی بھی، ہر رنگ کے مختلف لوگ۔ لیکن ان میں صرف ایک بات کی ہم آہنگی تھی۔ خدا سے کلام کی۔ ان کا آپس میں صرف آنسوؤں کا تعلق تھا۔ خدا کے نام پر آنکھوں کے نم ہونے کا تعلق۔ بے اختیار میں نے دعا کی، کاش میں بھی اس تعلق میں کہیں پرو دیا گیا ہوتا۔

"یہ سب سکون کی تلاش میں مسلمان ہوئے۔ ان میں سے کتنے ہی لوگ ہیں جو خودکشی کی آخری کوشش کرنے کے بعد زندہ سلامت نکل آئے تو ان کو خدا کی موجودگی کا یقین ہوا۔ خودکشی غیر مسلم کرتے ہیں۔ اتھیزم (ملحد)، مونوتھیزم (توحید پرستی)، پولی تھیزم (مختلف خداؤں کی پرستش)، یہ سب مختلف پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ خدا کی تلاش انہیں یہاں اس مسجد تک لے آئی۔ تم بھی شاید اسی لیے آئے ہو۔ یہاں روز کوئی نہ کوئی ایسا ضرور آتا ہے۔ پھر وہ انکار کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔" امام رک کر ہنسا۔ "پھر چند دنوں یا ہفتوں بعد وہ دوبارہ یہاں پڑا ہوتا ہے۔ خدا کے ہاں تفریق نہیں ہوتی۔ یہاں سب ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں۔ یہاں کوئی کسی کا خدا نہیں بنتا۔ تمہیں بھی قبول کر لیا جائے گا۔ تمہارا یہاں آنا پہلے سے

طے تھا، یہاں آنے کے بعد کی قسمت بھی طے ہے۔ تم جو بھی کر دیا کرنا چاہو، وہ تمہارے معاملے میں کارگر ثابت نہیں ہوگا، ہوگا وہی جو طے ہے۔ اب یہ تم پر ہے پہلی چوٹ پر پلٹتے ہو، یا گھسیٹتے ہوئے آتے ہو، خدا سب کو قبول کرتا ہے۔"

امام نے کندھے پر پڑی چادر تہہ کی، میرا ہاتھ پکڑ کر چھوا۔

"تمہیں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوگی۔ میں چلتا ہوں۔"

امام چلا گیا۔ میں وہیں پڑا رہا۔ دوپہر کی اذان دینے کے لیے کوئی اور امام آیا تھا۔ وہ سیاہ فام نہیں کوئی عربی تھا۔ مجھ سے کچھ پوچھے بغیر اس نے میرے سامنے کھانا رکھا۔ ہم نے خاموشی سے وہ کھایا۔ اور پھر امام نے اذان دی۔

جب صفیں کھڑی ہونے لگیں تو میں خاموشی سے مسجد سے نکل آیا۔ ایک اور دور کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

میں اپنے اپارٹمنٹ میں آ گیا تھا۔ مجھے لگا مجھ میں کوئی طاقت بھر دی گئی ہو۔ کوئی انجان سی قوت۔ اور مجھے لگا تھا میں ایک دم تندرست ہو گیا ہوں۔ جیسے درمیان میں کچھ نہ آیا ہو۔ پہلے جیسے، بغیر کسی خوف کے۔ ہوتا ہے نا ایسا بھی آپ خود کو ڈسچارج ہونے سے پہلے بالکل صحیح صحت مند سمجھتے ہیں؟

مجھے لگا میں ٹھیک ہو گیا ہوں، اور یہ سب بس ایک اتفاق تھا، لیکن رات کو بستر پر لیٹتے ہی میرے کانوں میں ایک آواز گونجی تھی۔

"لیکن کیا گارنٹی ہے کہ آگے بھی تمہیں خدا کی ضرورت نہیں ہوگی؟ آزک، میں سمجھتی ہوں کہ خدا انسان کو اپنی ضرورت محسوس کروانے کے لیے اس کی لگام ضرور کھینچتا ہے۔ جس کو

کسی کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خدا ہوتا ہے، اور انسان جب خدا بننے لگے تو اس کو اوقات یاد دلانے کے لیے خدا ضرور نازل ہوتا ہے۔"

ایک شام صوفیہ نے یہ کہا تھا۔ میں اس رات بہت دیر تک سر تھام کر اقرار کرتا رہا تھا، مجھے واقعی خدا کی ضرورت تھی۔

میں نے اگلے ہی دن امام کو کال کی۔ پھر میں اس سے متواتر رابطے میں رہا۔ کبھی لنچ، کبھی مسجد میں کوئی رات گزار لیتا، مجھے جانا پڑتا، مسجد میں ایک سکون تھا۔ جب عشاء کی نماز کے لیے امام کھڑا ہوتا، میں ایک دم پر سکون اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔ اور پھر مجھے امام فجر سے چند ساعت پہلے جگاتا۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں پوچھتا۔ صرف بتاتا تھا۔ سچ کیا ہے، کیا جھوٹ ہے، کیا خامیاں مسلمان حکومت میں ہیں، اور کیا غلطیاں حکمرانوں نے کی ہیں۔ وہ خدا کو انسان کی ضرورت کہتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے مجھے اللہ سے ملوایا۔

"خدا کو سب مانتے ہیں، لیکن ایک اللہ ہے۔ اللہ وہ نام ہے جو خدا نے قرآن میں اپنے لیے استعمال کیا ہے۔ جسے مسلمان یکتا مانتے ہیں۔ اپنی ذات میں بے مثال۔ مشکل کشا۔ وہ انسانوں کی باتیں سنتا ہے اور عملی طور پر جواب بھی دیتا ہے۔"

وہ مجھے مزید بتاتا رہا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا تھا۔

اس دن جب فجر کی نماز کے بعد نمازی دعا کر رہے تھے تو میں نے ہاتھ اٹھا کر کچھ مانگا تھا، میں نے پہلی دفعہ اللہ سے سکون مانگا تھا، اس سے اس کی ذات کا خود پر ظہور مانگا تھا۔

پہلی دفعہ ہاتھ نیچے کرنے سے پہلے مجھے یقین ہو چلا تھا میری دعا قبولیت والی فہرست کے قریب پہنچ گئی تھی۔

☆......☆......☆

مجھے امام نے چند مہینوں میں بہت حد تک اسلام سے روشناس کروادیا تھا۔ اس نے مجھے مختلف لوگوں سے ملوایا تھا جنہوں نے اسلام اپنی مرضی سے قبول کیا تھا۔ جن کے دلوں میں زخم اور شگاف تھے۔ محبت کا غم، بچھڑ جانے کا غم، تاریکی مایوسی میں خوبصورت سفید کرن خدا کی تھی۔ اللہ کی ذات آسمان اور زمین کا نور تھا، ان تاریکیوں کو ختم کرنے والا نور، دلیل اور روشنی والا نور۔

امام روجال حسینی نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں اسلام لے آؤں، وہ صرف نرمی سے میرے زخم کو سہلا رہا تھا۔ بالآخر ایک دن میں نے اسے اپنی کہانی سنائی۔ بہت دیر تک امام خاموش رہا، پھر وہ اٹھتا بولا۔

”تم خوش قسمت ہو۔ تم نے خدا کا راستہ خود تلاش کیا، اللہ کو اپنی مرضی سے جاننا چاہا، ورنہ اس واقعے نے بہت سے لوگوں کو سنگ دل بنا دیا ہوگا۔ اللہ نے تمہیں برے اثرات سے بچایا، تم بچے ہوئے ہو۔ میری دعا ہے تمہارے سفر کا اختتام سلامتی اور عافیت سے ہو۔“

مجھے ان کی بہت باتیں سمجھ نہیں آئی تھیں۔ مجھے امام سے ملاقات، مسجد میں رات گزارتے کافی عرصہ ہوگیا تھا۔ میں بہت کم اپنے اپارٹمنٹ جاتا تھا۔ میں نے صرف جاب جاری رکھی، وہ بھی صرف اس لیے کہ میں کسی نہ کسی طرح صحافت سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ دنیا کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں ایک اخبار سے وابستہ ہوگیا، جہاں میں اپنی مرضی سے لکھتا تھا۔ اس کے علاوہ میرا سارا وقت امام کے ساتھ گزرتا۔

دو سال ہوگئے تھے۔ میں دل میں اسلام قبول کرنا چاہتا تھا لیکن سامنے سے ہمت نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیا وجہ تھی کہ مجھے ایک جھجک تھی۔ امام میرے ساتھ ویسے ہی پرتپاک انداز میں ملتا تھا۔ میرے دل میں امام کی عزت اور وقار بہت اونچا تھا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ میں نے یہ مشکل فیصلہ بھی لے لیا۔ اس دن میں جینی سے ملا۔ وہ بھی میری طرح ٹراما کا شکار تھی۔ اس نے اس ٹراما سے نکلنے کے لیے شادی کرلی تھی، اور اب دو جڑواں سیاہ فام بچوں کی ماں تھی۔ مجھے وہ ایک مال میں ملی تھی۔ میں اتوار والے دن اپنے اپارٹمنٹ کے لیے کچھ سامان لینے نکلا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آگئی۔ بے اختیار میرے حواس پر اس خون آلود رات کا دباؤ چھانے لگا تھا۔

ہم ایک کیفے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''صوفیہ یاد ہے تمہیں آرزک؟'' اس نے خوابیدہ سی آواز میں کہا۔

''اگر تم اسے نہیں بھولی تو میں کیسے بھول سکتا ہوں؟'' میں نے شکوہ کناں لہجے میں اس سے کہا۔

''مجھے صوفیہ کی کٹی ہوئی گردن کا منظر آج بھی اینٹی ڈپریسنٹ لیے بغیر سونے نہیں دیتا۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ وہ نائجیرین مہمان تھی، جاناکا میں وہ صرف چند لوگوں سے وابستہ تھی اور صوفیہ ان میں سے ایک تھی۔ پھر اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور یہیں شادی کر کے قیام اختیار کرلیا۔

''مجھے بھی۔'' میں نے سر جھکایا۔

''چند سالوں سے مسلسل میں مسجد میں سوتا ہوں تا کہ مجھے وہ سب بھول جائے۔''

''مسجد میں؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔ مسلمانوں کی مسجد میں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''صوفیہ بھی اسلام سے بہت متاثر تھی۔'' وہ پھر ماضی میں چلی گئی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے، اس نے مرنے سے چند دن پہلے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مسلمان ہوتا

چاہتی ہے، لیکن وہ ابھی بین الاقوامی سطح پر ایک پراجیکٹ کر رہی ہے، اگر وہ مسلمان اور سیاہ فام ہو کر بڑے پیمانے پر بات کرے گی تو مغربی میڈیا کو ایک اور تعطل مل جائے گا۔ انتہا پسند مسلم ہونے کا! وہ نہیں چاہتی تھی کہ مذہب کی جنگ میں اصل بحث دب جائے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا مارک جانتا ہے کہ وہ باطنی طور پر مسلمان ہے۔" پھر ایک دم وہ رکی اور آس پاس دیکھ کر سرگوشی کی۔

"مجھے مارک پر شک ہے۔ اس کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا اس میں۔ وہ صوفیہ پر آخری دنوں میں چیختا چلاتا تھا، وہ اس سے خوفزدہ تھی۔" اس نے ایک بہت بڑا راز کھولا تھا۔ میرا شک صرف شک نہیں رہا تھا۔

"تو تم نے آواز کیوں نہیں اٹھائی؟ خاموش کیوں رہی؟" میں نے اندر کا لاوا دباتے ہوئے کہا۔

"کون میری بات سپورٹ کرتا؟ میں تو خود سائیکاٹرسٹ کے کلینک میں پائی جاتی تھی۔ میں اکیلے میں کیا کر لیتی۔"

پہلی دفعہ مجھے اندازہ ہوا، ہم میں سے نہ جانے کتنے اسٹوڈنٹس نے "ہم اکیلے کیا کر لیں گے؟" کہہ کر آواز ہی نہیں بلند کی۔ ہم کتنے بزدل تھے!

ہمارے درمیان کچھ صوفیہ کی یاد میں باتیں ہوئیں اور پھر میں وہاں سے اٹھ کر سید عالم امام کے پاس مسجد پہنچا، عصر کا وقت ہو رہا تھا جب میں نے اس سے کہا۔

"میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔"

میری بات سن کر وہ ایک دم سجدے میں گیا اور بہت دیر تک سجدے میں پڑا روتا رہا۔ مجھے اس کے اس عمل نے حیران کر دیا تھا۔

"میں نے کل رات تمہارے لیے بہت شدت سے دعا مانگی تھی کہ اللہ تمہیں اسلام کے لیے قبول کرلے۔ میری کوئی دعا اتنی برق رفتاری سے قبول نہیں ہوئی ہے۔" وہ رو رہا تھا۔ اس کو خود پر رشک آرہا تھا کہ رب نے اس کی دعا قبول کی۔ اور مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ اسلام تو میں نے اپنی مرضی سے قبول کیا تھا نا؟ یا پھر اللہ نے مجھے قبول کیا؟ کیا مطلب؟

امام نے مجھے اس کا مطلب سمجھایا۔

"نوکری کے لیے اپلائی اپنی مرضی سے کرتے ہو تم، لیکن انٹرویو کے بعد داخلہ اور موقع اسی کو ملتا ہے جو اس پوسٹ کے لیے اہل ہو۔ اللہ بھی دل کو جانتا ہے کہ کون کیسا ہے، اس کے بعد ہی وہ طے کرتا ہے۔ منافقین اور جھوٹوں کو اسلام میں اینٹری نہیں ملتی۔"

اس دن میں نے وضو، غسل کے آداب جانے تھے اور پہلا سجدہ کیا تھا۔

پہلا سجدہ آپ سمجھتے ہیں نا؟ اس سجدے میں بہت کچھ تھا۔ شکوہ بھی کہ مجھے پہلے ہی کیوں اسلام عطا نہیں کردیا گیا تھا؟ مجھے اتنی تکلیف میں کیوں رکھا۔ ویسا ہی شکوہ جیسے ناراض بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے۔

ایک تعلق استوار ہوا تھا، جو شاید میری پیدائش کے وقت میرے لیے لکھ دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

امام رد جال حسینی نے مجھے چھ مہینے میں قرآن کی آخری سورتیں حفظ کروادی تھیں۔ مجھے سکون عطا کردیا گیا تھا۔ میرا سکون آنسوؤں میں پوشیدہ تھا۔ ان آنسوؤں میں جو اللہ کے لیے بہتے تھے۔ جس میں امید پالینے کا اظہار تھا، خوشی تھی، سب کچھ تھا۔

میری راتیں ابھی بھی بے خواب تھیں۔ صرف مسجد کا ماحول پرسکون کرتا تھا۔ لیکن ایک ہلکی سی کسک میرے دل میں ہر وقت اٹھتی رہتی تھی۔

"تم چاہتے ہو میجر سرجری کے بعد تمہارے سارے زخم مندمل ہو جائیں۔ کچھ باقی نہ رہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ وقت لگے گا۔ تمہارا زخم گہرا تھا، پرانے زخم ناسور ہوتے ہیں اتنی آسانی سے نہ ہی بھرتے ہیں نہ ان کے آثار ختم ہوتے ہیں۔ تکلیف ہمیشہ ہوتی ہے۔ اگرچہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔" امام نے مجھے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

میری راتیں بے خواب تھیں، پرسکون تو میں تھا، لیکن بہت کچھ یاد آتا تو میرا دم گھٹنے لگتا۔

"تم ہجرت کیوں نہیں کر لیتے؟" ایک دفعہ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے جارج نے بھی کہا تھا لیکن اس سے کیا ہوگا؟"

"اللہ کی زمین بہت بڑی ہے، یہاں تمہیں ہر حوالے سے ماضی یاد آئے گا۔ کچھ عرصے کے لیے کسی اور ملک یا شہر چلے جاؤ۔ ماضی کو یہیں چھوڑ کر۔ اپنی فیملی شروع کرو، دین میں نکاح کا بہت زیادہ ثواب ہے۔ ایمان مکمل ہوتا ہے اس سے۔" اس نے مشورہ دیا۔

"میں کوشش کروں گا۔" میں نے مزید اس موضوع پر بات کرنے سے ان کو روکنے کے لیے فقط اتنا کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کی کھلتی سیاہی میں، میں نے بے اختیار اسے تنگ کرتے ہوئے چھیڑا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے، چند دنوں بعد تم نے کسی محفل میں بیٹھ کر میرے نام پر سر کھجانا ہے کہ کون، اچھا وہ؟ جس کو یہ یاد دلانا پڑتا ہے کہ اس کے آس پاس بھی انسان موجود ہیں؟ مجھے معلوم ہے، چند دنوں کے تعلق کے بعد جب تعلق پرانا ہو جائے تو اس کی جڑیں مزید کھوکھلی ہونے لگتی ہیں۔ ہر تعلق کی ایک میعاد ہوتی ہے جس کے بعد وہ ایکسپائر ہو جاتا ہے۔"

اسے ایک ضروری کال آ رہی تھی۔ یہ ضروری کالیں بعض اوقات بہت ضروری اوقات میں آتی ہیں۔ وسیع قطعے پر پھیلے چمن کی گھاس زرد اور خشک تھی۔ جیسے ویران، اجڑی، بے نور آنکھیں ہوا کرتی ہیں۔ خشک، اور موت سی سخت۔

اندھیرے میں چمن کی گھاس سیاہ لگ رہی تھی۔ قریب سے گزرتے نفوس ہمیشہ کی طرح معروف تھے، زندگی سے بھرپور۔ جن کو دیکھ کر انسان کو محسوس ہو یہ سب کتنے خوش ہیں، حقیقت میں وہ ہم جیسے ہی ہوتے ہیں، نہ خوش باش، نہ بے پرواہ، لیکن دور کے ڈھول! نظر کا دھوکا! شاید ہی کوئی انسان یہاں پر خوش ہو۔

اس نے موبائل سے سر اٹھا کر بہت سنجیدگی سے مجھے دیکھا، پھر ایک جملہ کہا۔ صرف ایک۔ وہ چند لمحے تھے۔ شاید پانچ سیکنڈ، شاید دس۔ لیکن ان لمحوں میں، میں نے ہر جذبہ محسوس کیا، خود پر رشک، خود سے نفرت، اس سے حسد، شاید اس سے عقیدت بھی۔۔ میں کوئی نام نہ دے سکا حقیقت میں وہ کیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

"نہیں، مجھے تم سے بات کرتے ہوئے۔۔۔" وہ رکی، جیسے کوئی مناسب لفظ ڈھونڈ رہی ہو۔ مجھے وہ تاثر ساری زندگی نہیں بھولے گا۔

"سکون، ہاں مجھے تمہارے پاس ہوتے ہوئے سکون ملتا ہے۔" اس نے کہا اور کال اٹینڈ کرنے کے لیے مجھ سے کچھ دور، لان کے قدرے خاموش گوشے کی طرف چلی گئی۔

وہ واحد لمحہ تھا جب مجھے لگا جیسے ابر آلود سیاہ آسمان پر اٹکا، دھندلایا ہوا واحد تنہا چاند ٹوٹ کر اس گھاس کے قطعے پر آ گرا ہے۔

مجھے صرف حیرت نہیں ہوئی تھی۔ مجھے کسی پر رشک آیا تھا۔ کبھی ہوا ہے آپ کے ساتھ ایسا؟ آپ خود آگ کا الاؤ ہوں، دہکتا کوئلہ ہوں، سیاہ، جھلستا ہوا لیکن کوئی آپ سے کہے کہ

آپ کے قریب آکر اسے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ سکون ملتا ہے۔ باوجود اس کے کہ آپ نے اپنی ساری زندگی سکون کی تلاش میں گزاری ہو۔ جرنلزم، سوشل ورک، مذہب، خدا کی تلاش، وحدانیت میں پناہ۔ لیکن ایک احساس ہو جیسے کچے گوشت کا جلتا ہوا ٹکڑا آپ کی روح کے ساتھ سی دیا گیا ہو۔ آپ کو سینے کے بیچ میں کوئی جلنے والی چیز ٹیسوں سے اپنی موجودگی کا احساس دلائے۔

مجھے سالوں پہلے کہیں پڑھی گئی بات یاد آئی۔ جن کے اندر بھٹیاں جل رہی ہوں، وہ دیکھنے میں پرسکون نظر آتے ہیں۔

جو خود جھلسا ہو وہ کیا کسی کو جلائے گا؟ زخمی تو خود دوا کی تلاش میں ہوتا ہے، وہ کہاں کسی کو زخم لگانے کا سوچے گا؟

سیاہی میں ایک طلسم جاگا، میں ذہنی طور پر اسی ہوٹل کے کمرے میں موجود تھا جہاں سالوں پہلے میں نے جمے ہوئے خون کا تالاب دیکھا تھا۔ سب کچھ دھندلا گیا تھا، حالانکہ میری بصارت بھی، لیکن وہ منظر نہیں بھولتا تھا۔

سینے میں موجود جلن اور گھبراہٹ مزید مشتعل ہوئی۔ کھو دینے کی تکلیف انسان کو کسی صورت سکون نہیں لینے دیتی ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی تعلق ہو، دوستی، محبت، عقیدت۔ ہر تعلق سے محرومی، انسان میں خلیج بنا دیتی ہے۔ اس منظر نے مجھے اب کتنے ہی دنوں کے لیے بے خواب رکھنا تھا۔

زائرہ عابدی سے میں نیویارک کے ایک بک فیسٹیول میں ملا تھا۔ امام رد جال نے مجھے ہجرت کے لئے راضی کر لیا تھا اور میں پی ایچ ڈی کے لیے نیویارک آ گیا تھا۔

آپ کو حیرت ہوئی نا؟ ہاں جس بات سے انسان زیادہ انکاری ہوتا ہے وہ ہمیشہ ہو کر

رہتی ہے۔

نیویارک میں بھی میں ویسا ہی خاموش سا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ میرا ظاہر کچھ خالص مسلمانوں کا سا نہیں تھا۔ ابھی تک میں خود کو اتنا متقی نہیں سمجھتا تھا کہ ظاہر میں بھی اپنا آپ مسلمان دکھاتا۔

''او سیڈ آئیز؟'' (اداس آنکھوں والے؟) کسی نے مجھے بک فیسٹیول میں مخاطب کیا تھا۔

''کیا تم یہاں سے ہٹ سکتے ہو، میری بکس کا بل بن گیا ہے میں نے پے کرنا ہے۔'' زائرہ نے مجھے مخاطب کیا۔ میں ذرا کھسکا۔ اس کی لمبی فہرست تھی کتابوں کی جو وہ خرید رہی تھی۔ وہ بہت گہرے مطالعے کے عنوانات تھے۔ ہسٹری، سیاست، مذہب، نوبل انعام یافتہ شخصیات۔ وہ سب کوئی ایک انسان شاید ہی پڑھ سکتا تھا۔

''شکریہ۔'' اس نے جاتے ہوئے مجھے شکریہ کہا۔ مجھے اس کا خود کو اداس آنکھیں کہنا عجیب لگا۔

یونیورسٹی میں ظہر کی نماز میں کامن روم میں پڑھ لیا کرتا تھا۔ وہاں کچھ اور لڑکے بھی تھے اس لیے حیرت کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی ایک دن زائرہ کسی کام سے وہاں گزر رہی تھی تو اس نے خوشی اور حیرت سے ملے جلے تاثرات سے مجھے پکارا۔

''سیڈ آئیز؟''

میں اس وقت جاگرز کے تسمے باندھ رہا تھا۔

''محمد آئزک۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس کی تصحیح کی۔

''یعنی محمد اسحاق!'' وہ خوشی سے بولی۔ ''تم مسلمان ہو؟''

''میں عرب ہوں۔ مطلب عربی ہوں۔'' اس کے جواب سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ

بھی مسلمان تھی۔

مجھے نہ جانے کیوں زائرہ میں وہ لڑکی نظر آئی جس سے میں کبھی دوبارہ نہیں مل سکا۔ جو مجھے کنگسٹن کی مسجد تک لے آئی تھی۔ پتہ نہیں وہ انسان تھی بھی کہ نہیں۔ شاید خدا نے کسی فرشتے کو انسان بنا کر میرے راستے میں بھیجا تھا۔

زائرہ عابدی مجھے سیڈ آئیز کہہ کر بلاتی۔ وہ اکنامکس کی طالبہ تھی۔

"مجھے سچ بولنے والے صحافی پسند ہیں۔" اس نے ایک دفعہ کہا تھا۔ یہ ہماری چوتھی اتفاقیہ ملاقات تھی، میرے تعارف پر اس نے یہی کہا تھا، میں مسکرا نہیں سکا تھا۔

پھر ایک دفعہ ہماری اتفاقیہ چھٹی ملاقات تھی۔ میں پارک میں زمین پر بیٹھا تھا، وہ ٹہلتے ہوئے میرے پاس آئی۔

"سلام صحافی۔ ایک بات بتاؤ تمہاری آنکھیں اتنی مجبور کیوں ہیں؟"

"وعلیکم السلام، تم یہ بتاؤ کیسے ڈھونڈ لیتی ہو مجھے ہر دفعہ؟" میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تمہاری طرف سے ایک مثبت انرجی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے تم بہت مجبور رہو۔ درد کو سہتے سہتے تمہاری آنکھیں خود اداسی کا مجموعہ بن چکی ہیں۔ یوں کہ فہم رکھنے والے تمہارے بارے میں دور سے کچھ غیر معمولی پن محسوس کر لیتے ہیں۔" اس نے وضاحت کی۔

شاید وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ میں خود کو صرف خود دیکھ رہا تھا، کمزور، خوفزدہ انسان۔ لیکن لڑتے لڑتے انسان عادی ہو جاتا ہے۔ شاید اپنے اندر کی ہلچل آنکھوں میں نظر آنے لگتی ہیں۔

"مجھے تم سے بات کرنے میں سکون ملتا ہے۔" بہت سی اتفاقیہ ملاقات ابھی مزید اتفاقیہ

نہیں رہی تھیں۔ ہم اکثر ایک دوسرے کے ڈورمیٹری سے دور پائے جاتے تھے۔ ہماری ڈسکشن مذہب کے گرد گھومتی۔ بالکل ایک سینئر، جونیئر کا تعلق تھا۔

"ہمارے عرب میں تو بہت خوبصورت سمجھا جاتا ہے اس طرح کے لوگوں کو جن سے آپ کو بات کرنے میں سکون ملے۔ جن سے آپ قرآن کی بات کریں تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو۔" اس دن اس نے مجھ سے کہا۔

"اگر میں تم سے پوچھوں کہ کیا تم مجھے زندگی میں ایڈ کرنا چاہو گے تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟" اس نے بہت کھلے انداز میں مجھ سے اس دن پوچھا۔

میں حیران رہ گیا۔

"میں نے ایسا کچھ سوچا نہیں تھا۔"

"تو ابھی سوچ لو۔" وہاں تحمل ہی تحمل تھا۔

"یہ مشکل ہے۔" میں خائف تھا۔

"یہ بے حد آسان ہے۔ میں جانتی ہوں تم حیران ہو رہے ہو گے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں تم کبھی کسی کو خود نہیں کہہ سکو گے۔ تمہارے اندر جو بھی چل رہا ہے وہ تمہیں کچھ بھی کہنے سے باز رکھتا ہے۔ تمہارے خوف تمہیں پریکٹیکل ہونے نہیں دیتے۔ میں ہر صورت میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔"

اس نے ایسے بات کی گویا یہ کسی پراجیکٹ یا پریزینٹیشن کی بات ہو شادی کی نہیں۔ میں کچھ کنفیوز رہ گیا تھا۔

"لیکن کیا یہ سب کچھ بہت جلدی ہے؟" میں نے کچھ تردد کیا۔

"اسحاق! ہم عرب ہیں، ہم فطرت کے مطابق بات کرتے ہیں۔ اگر تم اس کو میری

بہادری بجھ رہے ہو کہ میں تمہیں خود شادی کی پیش کش کر رہی ہوں تو گھبراؤ مت، میں تم سے صرف ایک بات ڈسکس کر رہی ہوں، میرے عرب والدین سے بات کر کے ان کو راضی تم ہی کرو گے، اور تمہاری عمر کیا ہے؟" اس نے بہت عام سے انداز میں کہا۔

"انتیس سال۔" میرے پاس کچھ کہنے کے لیے نہیں بچا تھا۔

"عقل یہ کہتی ہے کہ تیس سال کی عمر میں شادی کرنا جلدی نہیں ہوتا، یا تو بہت دیر ہوتی ہے یا بالکل وقت پر۔"

میں ٹک ٹک اس کو دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں کون تھی وہ۔

☆......☆......☆

میں نے امام رد جال کو فون پر بتایا تو وہ کافی دیر ہنستا رہا۔

"واہ کیا بات ہے بچے۔ جتنا تم فیملی شروع کرنے سے ڈر رہے تھے اتنا ہی تم پر نازل ہوگئی ہے۔ اگر تم نے اس لیے مجھے بتایا ہے کہ میں تمہیں مشورہ دوں، تو تمہیں میرے مشورے پر عمل بھی کرنا ہوگا جوان۔ تم اس کو ہاں کہہ دو۔ تم ساری زندگی پچھل نہیں کر سکو گے۔ اور دین بھی جلدی نکاح کا درس دیتا ہے، تمہیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔" اس نے دوٹوک انداز میں "مشورہ" دیا تھا۔

"لیکن، میں انسانوں کے معاملے میں بہت حد تک حساس ہو گیا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جو انسان مجھ سے کسی رشتے میں منسلک ہوتا ہے چاہے وہ دوستی کا رشتہ ہی کیوں نہ ہو، بہت جلد قدرت ایسے حالات بنا دیتی ہے کہ وہ مجھ سے چھین لیا جاتا ہے۔" میں نے اپنی ان سیکیورٹی بیان کی۔

"تو کیا ہوا؟ سب کو سب سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، چاہے کوئی بھی رشتہ کیوں نہ ہو،

وہ ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا، آپ کو صرف اچھی یادیں بنانی چاہئیں۔ ہر تعلق کو ایکسپائری ڈیٹ تک خوش اسلوبی اور خدا پر توکل سے گزارنا چاہیے۔ پھر قدرت متبادل بھی خود پیدا کرتی ہے۔" وہ بولا۔

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆......☆......☆

آج صبح میں زائرہ کے والد سے مل کر آیا ہوں۔ وہ عربی امام ہے۔ آپ کو یاد ہے میں نے آپ سے کہا تھا گلگشن کی سینٹرل مسجد میں امام رودجال کے بعد ایک عرب امام کی ڈیوٹی تھی جس کے ساتھ میں نے خاموشی سے کھانا کھایا تھا۔ زائرہ ان کی بیٹی ہے۔

مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا تب لگا جب امام راشد عابدی کے ساتھ امام رودجال حسینی بھی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے حیرت سے امام رودجال کو دیکھا۔

"ہاں تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ میں نے تمہیں گلگشن میں اپنے لیے داماد کے روپ میں پسند کیا اور ہم دونوں ہر نماز میں تمہارے اسلام قبول کرنے کی دعا کرتے تھے۔" امام راشد عابدی نے میری آنکھوں میں سوال پڑھ کر مجھے جواب دیا۔ میں مسکرا نہیں سکا تھا۔

"میں چاہتا ہوں تم سب بھول جاؤ۔ میں نے زائرہ کو تمہارا پتہ دیا تھا تاکہ وہ تم سے ملنے لگے۔ وہ سب کچھ جانتی ہے اسحاق!"

وہ دونوں باپ بیٹی مجھے آئزک کے بجائے اسحاق کہتے تھے۔ مجھے ان کا اسحاق کہنا اچھا لگتا تھا۔ میں نے امام رودجال کو دیکھا۔

"ایسے مت دیکھو مجھے آئزک۔ میں اب تمہارا ولی ہوں۔ میں خود زائرہ کے رشتے کا پیغام پہنچانے آیا ہوں، راشد عابدی! میں تم سے ولی بن کر زائرہ عابدی کو مانگتا ہوں۔" اس نے

مجھے شفقت بھرے انداز میں ڈانٹنے کے بعد امام راشد کو مخاطب کیا۔

اس ملاقات کے بعد شام کو میں نے زارا سے فون پر کہا۔

"تو سب کچھ پلاننگ کی تھی آپ لوگوں نے؟ مجھے کچھ نہیں بتایا؟"

"میں چاہتی ہوں تم اسے بھول جاؤ، میں نے بابا سے کہا تھا کہ میں کسی ایسے مسلمان سے شادی کروں گی جو اپنی مرضی سے اسلام قبول کر چکا ہو، تاکہ جب مجھے مستقبل میں بھی دین میں سستی ہو، تو وہ مجھے بتائے کہ میں پیدائشی مسلمان ہوں اور مجھے اس کی قدر کرنی چاہیے۔ پھر تمہاری بات اور تھی۔ تمہاری آنکھوں کی اداسی کی کہانی مجھے معلوم تھی۔ مجھے تمہارا کم بولنا، ذی فہم باتیں بہت سکون دیتی تھیں۔"

میں دیر سے ہنسا۔

"حالانکہ میں صرف وہ بولتا تھا جو امام ردجال مجھ سے کہا کرتے تھے۔"

"اور امام ردجال خود ریورٹ ہیں، وہ ایک سنگر (گلوکار) تھے، انہوں نے کئی دہائیوں پہلے میرے والد سے کلمہ پڑھا تھا۔ وہ وہی بولتے ہیں جو میرے بابا ان سے کہتے تھے۔ اس لئے مجھے تمہارا بہت کچھ اپنے جیسے لگا۔ ہنستے رہا کرو۔ زندگی غمگین رہنے کے لیے بہت چھوٹی ہے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ میں حیرت سے فون کو گھورتا رہا۔

میری ماں، صوفیہ، مارک، جینی، میں، ردجال حسینی، ہم سب کس چکر میں گھوم رہے تھے؟

ہم سب بدترین انسانوں میں سے تھے۔ کچھ کو اس رب نے اسفل سافلین میں رکھا۔ بدترین انسانوں میں۔ کچھ کو صالحین میں۔ اور کچھ کو دونوں میں۔ سب کی آزمائش مقصود تھی۔

ہم سب خود انسانوں کی ادنیٰ قسم ہیں۔ یہ اللہ ہے جو ادنیٰ کو اعلیٰ بناتا ہے۔